نعوذ باللہ تعالیٰ و جل شانہٗ

انتخابِ زرّیں

مرتبہ

سر سیّد راس مسعود بی۔اے (آکسفورڈ) پی۔ایچ۔ڈی
المخاطب بہ نواب مسعود جنگ بہادر

بارِ پنجم

۱۹۵۲ء

عنوان

طباعت بار اول	سنہ ۱۹۲۱ء
طباعت بار دوم	سنہ ۱۹۲۶ء
طباعت بار سویم	سنہ ۱۹۳۶ء
طباعت بار چہارم	سنہ ۱۹۵۱ء
طباعت بار پنجم	سنہ ۱۹۵۲ء

مطبوعہ نظامی پریس بدایوں

محمد احمید الدین پرنٹر و پبلشر

ملنے کا پتہ

نظامی بک ایجنسی بدایوں یو.پی

انتخابِ زرّیں

طبع چہارم

انتخابِ زریں کی مقبولیت کا پتہ اس سے چلتا ہے کہ آج ہم اس کا چوتھا ایڈیشن اس زمانے میں شایع کر رہے ہیں جبکہ اُردو کس مپرسی کی حالت میں کہی جاتی ہے۔ کاغذ اور طباعت کی گرانی کی حد ہو چکی ہے مگر کتاب کی مقبولیت اور اُس کی مانگ نے ہمیں مجبور کر دیا کہ ہم باوجود تمام دقتوں کے اس کا چوتھا ایڈیشن آپ کے ہاتھوں تک پہونچا رہے ہیں اس سال حکومت کشمیر نے اس کتاب کو انٹرمیجیٹ کے نصاب میں داخل کر کے ہماری جو حوصلہ افزائی کی ہے اس کے لئے ہم مشکور ہیں اور ہمیں اُمید ہے کہ اگر اِس کتاب کی مانگ اسی طرح باقی رہی تو ہمیں بہت جلد اس کا پانچواں ایڈیشن شایع کرنا پڑے گا اس جدید الطبع نسخہ کی اشاعت میں کوئی ترمیم نہیں کی گئی ہے بلکہ اکثر شعراء جو طبع سوم کے وقت زندہ تھے آج اس دارِ فانی سے کوچ

کر چکے ہیں ان شعراء کا حال اور کلام جس ترتیب سے دیا گیا ہے۔ وہ
ہی ترتیب اس نسخہ میں قایم رکھی گئی ہے صرف ناظرین کی آگاہی کے
لئے شاعر کے نمونۂ کلام سے پہلے سال رحلت لکھ دیا ہے۔

احمد الدین نظامی بدایونی

بدایوں - ۱۵ رجنوری ۱۹۵۱ء
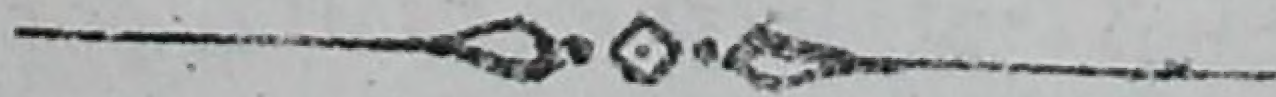
طبع سوم

سر سید راس مسعود بالقابہ نے سب سے پہلے ۱۹۲۱ء میں جبکہ وہ سرکار آصفیہ میں ناظم تعلیمات کے فرائض ادا کر رہے تھے اُردو ادب کے ان جواہر ریزوں کو ایک تاریخی سلسلہ میں منسلک کر کے ملک کے سامنے پیش کیا تھا۔ ان کا یہ انتخاب فی الواقع انتخاب زرّیں ثابت ہوا۔ دنیائے ادب نے اس کو نہایت عزّت کی نظر سے دیکھا۔ آج اس کا یہ تیسرا نسخہ ناظرین کرام کے ہاتھوں تک پہونچتا ہے۔ اس جدید الطبع نسخہ کی اشاعت کے وقت اکثر شعرا جو طبع اوّل کے وقت زندہ تھے آج اس دار فانی سے کوچ کر چکے ہیں لیکن اصل نسخہ میں ان کا کلام جس ترتیب سے دیا گیا ہے وہی ترتیب اس نسخہ میں بھی قایم رکھی گئی ہے صرف ناظرین کی آگاہی کیلئے ہیں نے شاعر متوفی کا سال رحلت لکھ دیا ہے۔ اس بے مثل انتخاب کی قبولیت

کی اصل وجہ یہ ہی کہ اس میں ایسے اشعار کے انتخاب سے احتراز کیا گیا ہی کہ جو سنجیدگی اور متانت کے درجہ سے گرے ہوئے ہوں زہرِ عشق اور مثنوی طلسمِ اُلفت کے اشعار بھی اگر انتخاب ہوئے ہیں تو ان میں ہوسناکی کی داستان اور بازاری بولی ٹھولی کا پہلو نظر نہیں آتا۔

اس انتخاب کو مرتب ہوئے سولہ سال گزر چکے ہیں اس مدت میں اردو شاعری میں انقلاب عظیم ہو چکا ہے اور اردو ادب نئے نئے شاعروں کے کلام سے روشناس ہو چکا ہے مثلاً جوش ملیح آبادی اور جگر مراد آبادی کے کلام کا آج کل بہت کچھ چرچا ہے ناظرین انتخاب ہذا کے صفحات ان شعراء کے کلام سے خالی پائیں گے اس کی وجہ ظاہر ہی کہ جس وقت یہ تذکرہ مرتب ہوا تھا ان کے کلام کی وہ شہرت نہ ہوئی تھی جو آج ہے۔

یہ امر مسلمہ ہی کہ ہر قوم کے اندر ایک روح ہوتی ہے اور ہر قوم کی فطرت ایک مخصوص قانون کی پابند ہوتی ہے جس سے اس کے ارتقا کی منزلوں کا تعین ہوتا ہے شاعر اسی قومی ارتقا اور فطرت کے قوانین سے متاثر ہو کر قومی جذبات کو شعر کے سانچے میں ڈھال لیتا ہے اس اجمال کی تفصیل حضرت جوش ملیح آبادی کے نمونۂ کلام سے بخوبی واضح ہو جاتی ہی۔ آپ فرماتے ہیں ؂

اُٹھا اور زمیں پہ نیا لالہ زار پیدا کر
نئے اصول جزا و سزا کی دے تعلیم
غلط ہی سازِ عجم ہو کہ لحن اعرابی
بہت بلند ہی سطح مذاق فکر جدید
کلاہ خواجگی کامیاب کج کر کے
بہار ہیں نو زمیں سے بہار اُلٹتی ہی

نہ آئی ہو جو کبھی وہ بہار پیدا کر
نیا تخیّل روزِ شمار پیدا کر
نیا ترانہ سپر شاخسار پیدا کر
نظر میں اوجِ سپر کو ہسار پیدا کر
نیا زمانہ نیا روزگار پیدا کر
جو مر دہی تو خزاں میں بہار پیدا کر

مذاق بندگی عصر نو کی تجھ کو قسم
نئے مزاج کا پروردگار پیدا کر

جگر مراد آبادی کا رنگ اس سے بالکل مختلف ہی ان کی شاعری غزل ہی تک محدود ہی دیگر اصناف سخن میں اُنھوں نے شاذ و نادر ہی قدم رکھا ہی یہی وجہ ہی کہ سیاسیات اور قومیات میں اُن کی نظموں کی تعداد بہت کم ہی اس لئے ہم شعارہ طور سے انکی ایک غزل کا انتخاب اس موقع پر پیش کرتے ہیں:-

بے نقاب آج جو یوں جلوۂ جاناں ہو جائے
ایک ذرہ کا اگر حسن نمایاں ہو جائے
حسن خود ہو نگراں عشق جو حیراں ہو جائے
عرش تک ہو نہیں سکتی جو رسائی نہ سہی
خام سمجھو طلبِ شوق کا اعجاز جگر

بجہاں پر ہو وہیں بیخود و حیراں ہو جائے
آدمی شدّتِ انوار سے حیراں ہو جائے
جان خود جسم بنے جسم اگر جاں ہو جائے
یہی انسان کی ہو معراج جو انساں ہو جائے
ہر نفس عشق میں جبتک شرگِ جاں ہو جائے

اس تمہید میں ان دو نئے شاعروں کے کلام کا نمونہ پیش کرنے سے میری صرف یہ غرض ہے کہ ناظرین پر ظاہر ہو جائے کہ ہماری زبان کی شاعری ارتقاء کی منزل میں ہے اور گزشتہ سولہ برس میں اس میں کیا کیا انقلاب رونما ہوئے ڈاکٹر اقبال اور فانی وغیرہ کے کلام کے انتخابات جو انتخاب رہیں گے قابل مولف نے اپنے تذکرہ کی پہلی ترتیب کے وقت زیب قلم فرمائے ہیں وہ بھی آج پرانے ہو چکے ہیں۔ اگر ان شعراء کے تازہ کلام پر نظر ڈالی جائے تو اس میں بھی کچھ نہ کچھ فرق نمایاں نظر آئے گا جس سے یہ صریح نتیجہ نکلتا ہے کہ آج کل ہماری معاشرتی اور سیاسی زندگی میں جو انقلابات ہو رہے ہیں ہماری شاعری بھی اس سے متاثر نظر آتی ہے کیونکہ جس طرح ہر انسان کی طبیعت جدت پسند واقع ہوئی ہے شاعر بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہمارے قدیم شعرا کا کلام بے مصرف ہو گیا ہے۔ یا ہمارا ادب اس سے بے نیاز ہو چکا ہے نہیں ہرگز نہیں۔ غالب۔ ذوق۔ انیس۔ دبیر۔ نظیر۔ داغ کا کلام آج بھی وہی مزا دیتا ہے جو نصف صدی قبل دیتا تھا۔ ان سے پہلے کے شعراء میں میر۔ درد۔ سودا سوز۔ انشا۔ مصحفی کے کلام کے مشہور نشتر آج بھی سننے والے کو اسی طرح بیچین کر دیتے ہیں جس طرح آج سے سو برس پہلے وہ دل میں جا کر چبھ جاتے تھے۔ یہ چھوٹا سا تذکرہ انھیں جواہر ریزوں کا حامل ہے جن سے ہمارے نوجوان اور ہماری آیندہ نسلیں ہمیشہ مستفید ہوتی رہیں گی۔

خاکسار نظامی بدایونی

۱۰ اپریل ۱۹۳۷ء

تمہید
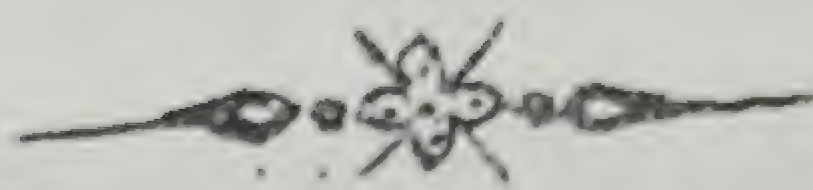
کسی قوم کی تہذیب و تمدن کے اندازہ کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اُس کے سرمایۂ نظم کا مطالعہ کیا جائے۔

چند سالہائے گزشتہ سے میں یہ ضرورت محسوس کر رہا ہوں کہ ایک ایسا انتخاب شایع کروں جس پر ایک نظر ڈالنے سے میرے ہم وطن دوستوں کو اُردو نظم کے بہترین حصہ کا لطف حاصل ہو جائے۔

یہ مجموعہ "انتخاب زرّیں" کے نام سے جو آج پیش کیا جاتا ہے نہ صرف ناظرین کے تفنن طبع کا سبب ہوگا۔ بلکہ اُن لوگوں کو جو اُردو نظم کی خوبیوں کے ایک گونہ منکر ہیں ثابت کر دیگا کہ وہ اس معاملہ میں غلطی پر تھے اور اس کے

مطالعہ سے ظاہر ہو جائے گا کہ اگر اردو شاعری کے بہترین حصّہ کا کسی دوسری قوم کی اچھی سے اچھی نظم سے مقابلہ کیا جائے تو اول الذکر کا درجہ گرا ہوا نہ رہے گا۔ درحقیقت جب اس بات پر غور کیا جاتا ہے کہ اُردو وہ زبان ہے جس کا شمار زمانہ حال کی نوزائیدہ زبانوں میں ہے تو یہ ایک معجزہ معلوم ہوتا ہے کہ اس قدر قلیل مدّت میں اُردو نظم کو وہ جِلا دے دی گئی جو مہذّب اور شستہ خیالات کے لئے سہل الاصول ہے۔

صرف ایک ذات واحد کا کیا ہوا انتخاب اُسی وقت ہر شخص کے مذاق کے مناسب ہو سکتا ہے جبکہ مولف کو قدرت سے ذہانت کا کافی حصّہ ملا ہو (بد قسمتی سے میں اس سے کوسوں دور ہوں) جو اصول میں نے اس انتخاب میں مدِّنظر رکھا ہے وہ نہایت سادہ ہے میں نہ شاعر ہوں نہ فن سخن کا نقاد کامل لیکن مجھے اپنی قوم کے فن شعر کے ساتھ سچّا عشق ضرور ہے میں نے وہی کلام انتخاب کیا ہے جس کو میرے دل نے پسند کیا۔ جن اشعار نے مجھ پر گہرا اثر کیا انھیں کو میں نے اس تذکرہ میں لیا ہے اور جن اشعار سے صرف عارضی اور فوری ولولہ پیدا ہوتا تھا ان کو ترک کر دیا خلاصہ یہ کہ میرا آفتاب ہی اس معاملہ میں میرا رہنما تھا پس اگر ناظرین کو اس انتخاب میں کوئی سقم نظر آئے تو وہ اسے اُردو نظم کا نقص نہ خیال کریں بلکہ فی الواقع وہ اس کو میرے مذاق کی کمی سمجھیں۔

میں اس موقع پر اس بات کا اظہار بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ مجموعہ بالخصوص ان اصحاب کے لئے کیا گیا ہے جو میری طرح اس نئی روح پر جو ہماری شاعری

میں پھونکی جارہی ہی نگاہ رکھتے ہیں اور قدیم طرز کے خیالات کے شیدائی نہیں ہیں یہی وجہ ہی کہ بہت سی مشہور غزلوں کو جن میں وہ خیالی مضامین نظم کئے گئے ہیں جو ایک زمانہ میں ہماری پُرانی شاعری کی جان سمجھے جاتے تھے۔ (لیکن افسوس! کہ موجودہ زمانہ میں ان کا ہمارے جذبات پر کچھ اثر نہیں ہوتا) انتخاب میں جگہ نہیں دی گئی ہی۔

اس وقت تک اُردو نظم کے جس قدر انتخاب میری نظر سے گذرے ہیں اُن سب میں میرے معزز دوست مسٹر الیاس برنی پروفیسر معاشیات عثمانیہ یونیورسٹی کے انتخاب جو حال ہی میں شائع ہوئے ہیں بلاشبہ بہترین ہیں۔ اُنھوں نے ہر مضمون کی نظموں کو جداگانہ حصوں میں ترتیب دینے کی جو تکلیف اُٹھائی ہی میں کافی طور سے اس کی داد نہیں دے سکتا۔ انکی یہ کوشش جاری ہی اور وہ وقتاً فوقتاً اس کی اور جلدیں شائع کریں گے اس کے مقابلہ میں اس مجموعہ کے پیش کرنے کے متعلق میری حقیر کوشش کچھ حقیقت نہیں رکھتی اور نہ وہ آئندہ جاری رہنے والی ہو میں نے شعرا، کا مختصر حال اور اُن کا کلام اُن کے زمانہ کی ترتیب کے لحاظ سے دیا ہی۔ یعنی متوفی شاعروں کو ان کی سن وفات کی ترتیب سے اور اپنے زمانے کے زندہ شعرا، کو ان کی سال پیدائش کے لحاظ سے درج کیا ہی۔ اگر میرے وہ دوست جو مجھ سے کچھ واقفیت رکھتے ہیں اس رسالہ کو مطالعہ کرنے کے بعد مجھ سے اور زیادہ خصوصیت کیساتھ

واقف ہو جائیں گے۔ تو میں یہ سمجھوں گا کہ میری محنت پورے طور سے وصول ہو گئی

خاکسار

سیّد راس مسعود

حیدرآباد دکن

۶ راگست ۱۹۲۱ء

فہرست شعراء

اس فہرست میں ہر شاعر کو بہ ترتیب حروف تہجی درج کیا گیا ہے اور نمبر صفحہ جس پر اس شاعر کا کلام ملتا ہے اس کے محاذ میں لکھ دیا ہے

ب

سید راس مسعود المخاطب بہ نواب مسعود جنگ بہادر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حصہ اوّل

(۱) ولی دکنی ۱۷۴۲ء

ولی محمد یا ولی اللہ نام تھا بعض تذکرہ نویسوں نے ان کا نام شمس الدین
لکھا ہے جو صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ ان کی ولادت اور وفات کے سال میں
اختلاف ہے۔ بقول صاحب تذکرہ شعرائے دکن ولادت ۱۰۵۳ھ مطابق ۱۶۴۳ء اور
وفات ۱۱۵۵ھ مطابق ۱۷۴۲ء میں ہوئی یہی تاریخیں قرین قیاس معلوم ہوتی ہیں۔
ولی کا مولد اورنگ آباد (دکن) تھا اسی وجہ سے وہ دکنی مشہور ہیں۔ وفات احمد آباد گجرات
میں ہوئی۔ ولی کو اردو شاعری کا "باوا آدم" کہا جاتا ہے اگرچہ اردو زبان میں
ردیف و قافیہ کے التزام کے ساتھ غزل سرائی کرنے والے شاعر ان سے پہلے بھی گزرے ہیں

ولی کے وقت سے سامنے زمانے کی اُردو میں نمایاں فرق ہوگیا ہے اور ان کے دیوان کو موجودہ اُردو ادب میں قدیم اُردو کا مرتبہ حاصل ہوچکا ہے لیکن آج بھی باوجود صدیاں گزر جانے کے بعض بعض اشعار ان کے دیوان میں بہت صاف ملتے ہیں مثلاً وہ فرماتے ہیں ؎

مفلسی سب بہار کھوتی ہے مرد کا اعتبار کھوتی ہے

ولی کا دیوان مختلف مطابع میں چھپ چکا ہے لیکن اب کمیاب ہے اس کا ایک اڈیشن پیرس میں نہایت اہتمام کے ساتھ ۱۸۳۳ء میں شائع ہوا تھا جس کا دیباچہ فرانسیسی زبان میں مسٹر جے ہیل گریسن ماسی نے لکھا ہے۔ اس کے بعد حضرت احسن مارہروی کا مرتبہ دیوان ولی مع فرہنگ ۱۹۲۷ء میں انجمن ترقی اُردو حیدرآباد دکن نے شائع کیا ہے جو نظامی بک ایجنسی بدایوں سے بھی مل سکتا ہے۔ کلام کا نمونہ یہ ہے:-

(۱)

دل طلب گار ناز مہوش ہے لطف اس کا اگرچہ دلکش ہے
مجھ سوں کیونکر ملیگا حیران ہوں شوخ ہے بے وفا ہے سرکش ہے
کیا تری زلف کیا تری ابرو ہر طرف سوں مجھے کشاکش ہے
تجھ بن ای داغ عشق سینہ و دل چمن لالہ دشت آتش ہے

ای ولی تجربہ سوں پایا ہوں
شعلہ آہ شوق بے غش ہے

(۲)

حُسن تیرا ہر بُرج پہ فاضل ہے
مُکھ تیرا رشکِ ماہ کامل ہے

رات دن تجھ جمال روشن کوں
فضل پروردگار شامل ہے

جس کوں تجھ حُسن کی نہیں ہے خبر
بے گماں دو جہاں میں غافل ہے

عشق کی راہ کے مسافر کوں
ہر قدم تجھ گلی میں منزل ہے

اے ولی طرزِ عشق آساں نہیں
آزمایا ہوں میں کہ مشکل ہے

(۳)

غفلت میں وقت اپنا نہ کھو ہشیار رہو ہشیار رہو
کب تک رہے گا خواب میں بیدار رہو بیدار رہو

گر دیکھنا ہے مدّعا اُس شاہِ معنی کا تو
ظاہر پرستاں سوں سدا بیزار رہو بیزار رہو

جیوں چتّر داغِ عشق کوں رکھ سر پہ اپنے اوّلاً
تب فوج اہلِ درد کا سردار رہو سردار رہو

وہ نورِ چشمِ عاشقاں ہے جیوں سحر جگ میں عیاں
اے دیدہ وقتِ خواب میں بیدار رہو بیدار رہو

مطلع کا مصرعہ اے ولی وردِ زباں کر رات دن

غفلت میں وقت اپنا نہ کھو ہشیار رہو ہشیار رہو

(۴)

مفلسی سب بہار کھوتی ہے	مرد کا اعتبار کھوتی ہے
کیوں کہ حاصل ہو مجھ کوں جمعیت	زُلف تیری قرار کھوتی ہے
ہر سحر شوخ کی نگہ کی شراب	مجھ انکھاں کا خمار کھوتی ہے
کیوں کہ ملنا صنم کا ترک کروں	دلبری اختیار کھوتی ہے

اے ولی اب اُس پری رو کی
مجھ سے دل کا غبار کھوتی ہے

(۲) سودا ۱۷۸۱ء

میرزا محمد رفیع نام ۱۱۲۵ھ (۱۷۱۳ء) میں بمقام دہلی ولادت ہوئی۔ ان کے بزرگ تجارت کرنے کے لئے کابل سے ہندوستان میں آئے تھے اور ایسی رعایت سے اُنھوں نے سودا تخلص اختیار کیا تھا۔ شاہ حاتم کے تلامذہ میں نامور اور اپنے زمانہ کے مسلم الثبوت استاد تھے۔ حضرت میر کے ہمعصر تھے اُنھوں نے قصائد کے لحاظ سے اُردو کو فارسی کا ہم پلہ بنا دیا تھا تمام اصناف سخن پر قدرت رکھتے تھے خصوصاً ہجو گوئی میں کمال حاصل تھا جب دہلی اُجڑ کر لکھنؤ آباد ہوا تو دیگر اہل کمال کے ساتھ شعرا میں سب سے پہلے میرزا صاحب لکھنؤ کو منتقل ہوئے اور وہیں بہ عمر ۷۰ سال ۱۷۸۱ء مطابق ۱۱۹۵ھ میں انتقال کیا

ان کی کلیات کو ۱۱۹۵ھ میں حکیم سید اصلح الدین خاں نے مرتب کیا تھا جو ہر جگہ دستیاب ہو سکتی ہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو :-

(۵) غزل

نسیم ہے ترے کوچے میں اور صبا بھی ہے
ہماری خاک سے دیکھو تو کچھ رہا بھی ہے

ترا غرور مرا عجز تا کجا ظالم
ہر ایک بات کی آخر کچھ انتہا بھی ہے

جلے ہے شمع سے پروانہ اور میں تجھ سے
کہیں ہے مہر بھی جا میرے کہیں وفا بھی ہے

زبان شکوہ سوا اب زمانے میں ہیہات
کوئی کسی سے بہم دیگر آشنا بھی ہے

ستم روا ہے اسیروں پہ اس قدر صیاد
چمن چمن کہیں بلبل کی اب نوا بھی ہے

(۶)

ٹوٹے تری نگہ سے اگر دل حباب کا
پانی بھی پھر پئیں تو مزہ ہے شراب کا

دوزخ مجھے قبول ہے اے منکر و نکیر
لیکن نہیں دماغ سوال و جواب کا

غافل غنیمت ہے کہ جو یہ نہ رکھ نظر
پیری ہے شرار و برق سے دامن سحاب کا

قطرہ گرا تھا جو کہ مرے اشک گرم سے
دریا میں ہے ہنوز بھبھولا حباب کا

اے برق کس طرح سے مرا جی اس سے چھوٹے
نقشہ ہے جھلکتا لمحے ترے اضطراب کا

زاہد سمجھی ہے نعمت حق جو ہے اکل و شرب
لیکن عجب مزہ ہے شراب و کباب کا

سودا نگاہ دیدہ تحقیق کے حضور
جلوہ ہر ایک ذرہ میں ہے آفتاب کا

(۷)

جوں غنچہ نو چمن میں بند قبا کو کھولے
پھر گل سے اے پیارے بلبل کبھو نہ بولے

آوے گا وہ چمن میں ٹک کے ہی مے کشی کو
شبنم سے کہہ کے بلبل پیالے اگلوں کے دھو لے

باغِ جہاں میں آ کر کچھ ہم نے پھل نہ پایا
اک دل ملا کہ جس میں ہیں سیکڑوں پھپھولے

ایسا ہی جاؤ جاؤ رکھتے ہو تو سدھاؤ
اس دل پہ کل جو ہوتی سو آج ہی وہ ہو لے

کم بولنا ادا ہے ہر چند پر نہ اتنا
منہ چاہیں چشمِ عاشق تو بھی وہ لب نہ کھولے

چشمِ پُر آب ہوں میں جیوں شیشۂ حبابی
مدت رک کے ٹر گئے ہیں چھاتی ہیں سب پھپھولے

کون ایسا ایسا ہے جو سودا گلی میں اس کی
اب تجھ کو لے چلیں ہم دل کھول کر تو رو لے

(۸)

نے بلبلِ چمن نہ گلِ نو دمیدہ ہوں
میں موسمِ بہار میں شاخِ بریدہ ہوں

گریاں بہ شکلِ شیشہ و خنداں بہ طرزِ جام
اس میکدے کے بیچ عبث آفریدہ ہوں

کوئی جو پوچھتا ہو یہ کس پر ہے داد خواہ
جیوں گل ہزار جا سے گریباں دریدہ ہوں

تیغِ نگاہِ چشم کا تیرے نہیں حریف
ظالم میں قطرہ قطرۂ خونِ چکیدہ ہوں

کس سے کروں میں دعویٰ دل جائیے اے خدا
دلدادۂ زلف ہوں رخِ دلبر ندیدہ ہوں

کرتا ہے جا کے گل کی تسلی چمن میں تو
خونِ جگر میں یہی تو دامن کشیدہ ہوں

غافل ہے کیوں مراحیِ فرصت سے گوشِ دل
اے بے خبر میں نالۂ حلقِ بریدہ ہوں

دہلی کے اُجڑ جانے پر اکثر شریف خاندانوں نے اپنے وطن کو خیرباد کہنی شروع کر دی تھی مگر توکل اور قناعت نے انھیں دہلی سے باہر نہ جانے دیا اور اپنے سجادے پر بیٹھے رہے خواجہ صاحب نے ۲۰ جنوری ۱۸۸۵ء مطابق ۴ صفر ۱۲۹۹ھ کو انتقال فرمایا نمونہ کلام یہ ہے۔

غزل (۱۰)

ہم نے کس رات نالہ سر نہ کیا — پر اُسے آہ نے اثر نہ کیا

کتنے بندوں کو جان سے کھویا — کچھ خدا کا بھی تو نے ڈر نہ کیا

دیکھنے کو رہے ترستے ہم — نہ کیا رحم تو نے پر نہ کیا

آپ سے ہم گزر گئے کب کے — کیا ہے ظاہر میں گو سفر نہ کیا

کونسا دل ہے وہ کہ جس میں آہ — خانہ آباد تو نے گھر نہ کیا

کیوں بھویں تانتے ہو بندہ نواز — سینہ کس وقت میں سپر نہ کیا

سب کے جوہر نظر میں آئے درد
بے ہنر تو نے کچھ ہنر نہ کیا

(۱۱)

اگر یوں ہی یہ دل ستاتا رہے گا — تو اک دن مرا جی ہی جاتا رہے گا

میں جاتا ہوں دل کو ترے پاس چھوڑے — مری یاد تجھ کو دلاتا رہے گا

گلی سے تری دل کو لے تو چلا ہوں — میں پہونچوں گا جب تک یہ آتا رہے گا

جفا سے غرض امتحانِ وفا ہے — تو کہہ کب تلک آزماتا رہے گا

قفس میں کوئی تم سے اے ہم صفیرو
خبر گل کی ہم کو سناتا رہے گا

خفا ہو کے اے درد مر تو چلا تو
کہاں تک غم اپنا چھپاتا رہے گا

(١٢)

وہ دن کدھر گئے کہ ہمیں بھی فراغ تھا
یعنی کبھو تو اپنے بھی دل کا دماغ تھا

جلتا ہے اب ترا خس و خاشاک میں ملا
وہ گل کہ ایک عمر چمن کا چراغ تھا

گذرا ہوں جس خرابے پہ کہتے ہیں آگے یہ
ہے کوئی دن کی بات یہ گھر تھا یہ باغ تھا

(١٣)

نہ مطلب ہے گدائی سے نہ یہ خواہش کہ شاہی ہو
الٰہی ہو وہی جو کچھ کہ مرضی الٰہی ہو

نگینے کے سوا کوئی بھی ایسا کام کرتا ہے
کہ ہو نام اور نہ کار روشن اور نہ روسیاہی ہو

نہیں شکوہ مجھے کچھ بے وفائی کا تری ہرگز
گلہ تب ہو اگر تو نے کسی سے بھی نباہی ہو

(١٤)

ہر سینہ تھا نشاں میرے ہی اشک غم سے
تھے سیکڑوں ہی نالے و البتہ ایک دم سے

واقف نہ یاں کسو سے ہم ہیں نہ کوئی ہم سے
یعنی کہ آ گئے ہیں بہکے ہوئے عدم سے

میں گو نہیں ازل سے پر تا ابد ہوں باقی
پھیرا جا وقت آخر جا ہی کھڑا انجام سے

گر چاہیے تو ملیے اور چاہیے نہ ملیے
سب تم سے ہو سکے ہے ممکن نہیں تو ہم سے

مشتاق گر ترا کچھ لکھے تو کیا عجب ہے
ہوں مثل نرگس آنکھیں پیدا ابھی قلم سے

ہر چند یہ تمنا درخور نہیں ہمارے
اب ہیں کہاں وہ نالے ہم گشتگی کی ہر ہے
ہے ایک نگاہ کافی گو ہووے گاہ گاہے
کاہے کو ہوتی ہم کو گردش نصیب طالع
آتے ہیں تا ام ہیں کب جو رشتہ رو کسیہ کے

نزدیک تیرے جو آئے کیا دور ہے کرم سے
تھیں سب وہ باتیں جیتے ہیں تا میر دم قائم سے
چنداں نہیں ہے مطلب عاشق کو پیش و کم سے
گر پاؤں اپنا باہر رکھتے نہ ہم عدم سے
اے شیخ یہ نہیں ہیں تسبیح کے سے تھمے

ہے درد پر بھی کچھ تو بہتر ہی ہے یہ بیت
گھبرے ہے اور یہی غم چھوٹے جو ایک غم سے

(۱۵) رباعیات

ہم نے بھی کبھی جام و سبو دیکھا تھا
ان باتوں کو اب جو غور کرتے ہیں درد
جو کچھ کہ نہیں ہے رو برو دیکھا تھا
کچھ خواب سا تھا کہ وہ کبھو دیکھا تھا

(۱۶)

کس کا کون! کیا کسو سے کہنا
گذرے ہے ایک طرح سے تنہا اے درد
اپنا اپنا ہر ایک کا لہنا
رونا جینے کے پڑے اکیلے رہنا

(۴) حسن سنہ ۱۷۸۹ء

میر غلام حسن خلف غلام حسین ضاحک۔ بزرگوں کا اصلی وطن ہرات ہے مگر دہلی میں پیدا ہوئے۔ قدیم وضع کے بزرگ تھے۔ آپ نے ابتدا میں میرزا رفیع سودا سے

جو سینہ کھلا ہے تو دل چاک ہے　　غم آلودہ صبح طربناک ہے

نہ منظور ہے اُن کو نہ کا ہے کا کام　　نظر میں ہے تیرہ بختی کی شام

ولیکن یہ خوبوں کا دیکھا بھاؤ　　کہ بگڑے سے دونا ہوا ان کا بناؤ

جو ماتھے پہ چینِ جبیں غم سے ہے　　تو وہ بھی ہے اک موج دریا میں

وہ آنکھیں جو روتی ہیں بس پھوٹ پھوٹ　　تو گویا کہ موتی بھرے کوٹ کوٹ

گریبان سینہ پہ جو ہے کھلا　　تو گویا ہے وہ صبح عشرت نما

نقاہت سے چہرہ اگر زرد ہے　　دیا آہ ہونٹوں پہ کچھ سرد ہے

ادا سے نہیں یہ بھی عالم جدا　　کہ ہے چاندنی اور ٹھنڈی ہوا

(۱۸) خوابگاہ

وہ پھولوں کی خوشبو وہ ستھرا پلنگ　　جوانی کی نیند اور وہ سونے کا رنگ

سرا سر اُدھر نیچے زری بافت کے　　کہ تھے رنگ آئینۂ صاف کے

کھنچی چادر اک اس پہ شبنم کی صاف　　کہ ہو چاندنی جس صفا کا غلاف

کسے اس پہ گدّے وہ منقش کے　　کہ چھپیوں میں تھے جن کے موتی ٹکے

دھرے اس پہ تکیے کئی نرم نرم　　کہ گل کو ہو جس کے دیکھے سے شرم

(۱۹) شوخیِ رفتار

عجب چال سے وہ چلے نازنیں　　کہ مستی میں پاؤں کہیں کا کہیں

بندھا سر پہ جوڑا اڑی زرد شال　　کمر کی لچک اور ٹھسک کی وہ چال

چلی واں سے دامن اُٹھاتی ہوئی	کڑے سے کڑے کو بچاتی ہوئی
عجب ایک عالم تھا بے ساختہ	کہ عالم کا تھا اُس سے دل باختہ

(۵) قائم ۱۷۹۴ء

شیخ محمد قائم نام تھا قصبہ چاند پور ضلع بجنور روہیل کھنڈ کے رہنے والے تھے ابتدا میں خواجہ میر درد سے مشورہ سخن رکھتے تھے پھر میرزا رفیع سودا کے شاگرد ہوئے۔ ان کا شمار ریختہ کے اُستادوں میں ہے۔ سلاست اور صفائی ان کا حصہ تھی ان کے بعض اشعار ضرب المثل کے درجہ تک پہونچ گئے ہیں مثلاً ؎

دردِ دل کچھ کہا نہیں جاتا   آہ چُپ بھی رہا نہیں جاتا

اپنے وطن میں ۱۲۰۷ھ مطابق ۱۷۹۴ء میں انتقال کیا ایک مکمل دیوان چھوڑا کوئی صنف کلام ایسی نہیں ہے جو اس دیوان میں نہ ہو۔ لیکن دیوان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ غزل اور مثنوی سے اس شاعر کی طبیعت کو بہت لگاؤ رہا ہے ان کا دیوان ہنوز طبع نہیں ہوا۔ عرصہ ہوا ایک انتخاب مولانا حسرت موہانی نے شائع کیا تھا اور دوسرا انتخاب قائمانہ اشعار کے نام سے نواب عماد الملک بہادر بلگرامی نے ترتیب دیا ہے جو مدراس یونیورسٹی کے نصاب میں داخل ہے۔

(۲۰) غزل

مجھ سا کوئی جہاں میں آشفتہ سر نہیں	ہے یوں تو زلفِ یار بھی پر اس قدر نہیں

ساقی تو شب کی درت درازی معاف کر — ظالم قسم ہے مجھ کو مجھے کچھ خبر نہیں
یارب خلش سے آہ کی ہو جو نہ بہرہ مند — جس دل کا تکیہ گاہ سر نیشتر نہیں
جوں اشک ایک لغزش پا میں گئے ہیں پار — ہستی سے تا بہ نیستی چنداں سفر نہیں
ہنا رہ ہوں بیخودی کا میں اُس مست کی جیسے — آشوب روز حشر سے اصلا خبر نہیں

(۲۱)

ایک جا گر یہ نہیں ہے مجھے آرام کہیں — ہے عجب حال مرا صبح کہیں شام کہیں
اُس گھر سے نگہ شوق لپٹتی تو ہے لیک — جی یہ ڈھڑکے ہے کہ آ جائے نہ الزام کہیں
تم نے کی دل کی طلب ہم نے کہا دینگے دیلیک — یوں یہ فرمائشیں ہوتی ہیں سرانجام کہیں
پائے دیوار سے پھر میری طرح وہ نہ اُٹھا — جن نے دیکھا تجھے اک بار سر بام کہیں
عذر تقصیر بھی چاہوں گا میں اس سے اے دل — ٹک تو خاموش ہو دینے سے وہ دشنام کہیں

عزم کعبہ کا تو قائم نے کیا ہے لیکن
رہن مے کیجو نہ ؛ ان جامۂ احرام کہیں

(۲۲)

گہ پیر شیخ و گاہ مرید مغاں رہے — اب تک تو آبرو سے بنی ہے جہاں رہے
صبر و قرار و ہوش دل و دیں تو واں رہے — اے ہم نشیں یہ کہہ تو بھلا ہم کہاں رہے
دُنیا میں ہم رہے تو کئی دن پر اس طرح — دشمن کے گھر میں جیسے کوئی میہماں رہے
اُڑ دیا۔ دل کو سب نے ہو کہا تم ہیں تو یاں — بہ جھینکنا پڑا ہے کسی طرح جاں رہے

قسمت تو دیکھ یار بھی اپنا اگر اقرباؤں
پیارے ہمیشہ ایک سی رنجش ہی ہجر بہ لطف

جس دوشیت پر خطر ہی کئی کارواں رہے
ناخوش کبھی ہوئے تو تبھی مہرباں رہے

مسجد سے تجھ نے شیخ نکالا ہمیں تو کیا
قایم نہ ہو فروش کی اپنی دکاں رہے

(۶) سوز ۱۷۹۷ء

سید محمد نام تھا قبہ اول پور ضلع شاہجہاں آباد کے ساکن ۔ ان کے کلام میں ان کے تخلص کا پورا اثر نمایاں ہے یعنی ان کا ہر شعر سوز و گداز میں ڈوبا ہوا ہے ۱۷۹۷ء مطابق ۱۲۰۹ھ میں بمقام لکھنؤ انتقال کیا ۔ نمونہ کلام یہ ہے :-

(۲۳) غزل

دیکھ دل کو چھیڑ مت ظالم کہیں کہ جائیگا
قتل کی نیت تو کر آیا ہے تو کیا دیر ہے

ہاں بغیر از قطرہ خوں اور تو کیا پائے گا
ہاں مگر تو مار کر ظالم بہت پچھتائے گا

پھر کبھی کہتا ہوں تجھے آ سوز کو یوں مت ستا
مت ستا ظالم ! کہیں تو بھی ستایا جائے گا

(۲۴)

تڑپتی کیوں ہے ای بلبل کمال اتنا تو پیدا کر
یہاں تک گر پورا چاہیے گر جائے گلشن ہو

کہ تیرا اشک حسن جا گر پڑے گلزار ہو پیدا
بجلائے ہر رگ گل رشتہ زنار ہو پیدا

نیم قتل خنجر مژگاں ہوں کیا یہ بھی تعجب ہے	کہ ہمرنگ حنا ہے سبزی کی جاگہ نمار ہو پیدا

مسیحائی ہے تیری تیغ میں کیا سوز گو ذرا ہے
جو لاکھوں بار ہووے قتل لاکھوں بار ہو پیدا

(۲۵)

اگر میں جانتا ہی عشق میں دھڑکا جدائی کا	تو محشر تک نہ لیتا نام ہرگز آشنائی کا
نہ پہونچے آہ و نالہ گوش تک اُس کے کبھو اپنا	بیاں ہم کیا کریں طالع کی اپنے نارسائی کا
خدایا کس کے ہم بندے ہیں کہاں دیں سخت مشکل ہے	رکھے ہے ہر قسم سے دہر میں دعوی خدائی کا

خدا کی بندگی کا شوق ہے دعوی تو خلقت کو
ولے دیکھا جسے بندہ ہے اپنی خودنمائی کا

(۷) میر ۱۸۱۰ء

میر محمد تقی اکبرآباد میں پیدا ہوئے۔ دہلی میں تعلیم و تربیت پائی۔ عالی دماغی نازک مزاجی میں یگانۂ روزگار تھے۔ اردو شاعری کے خدائے سخن اور مسلم الثبوت استاد مانے جاتے ہیں کلام گوناگوں خوبیوں سے لبریز ہے غزل گوئی میں حسن و عشق کے علاوہ اخلاق، فلسفہ حکمت کے مضامین پائے جاتے ہیں اردو غزل میں آپ کا وہ رتبہ ہے جو حضرت سعدی کا فارسی غزل میں ان کے کلام میں سادگی کے ساتھ وہ درد بھی ہے جو دوسرے شاعر کے کلام میں شاذ پایا جاتا ہے۔ آخر عمر میں زمانہ کی گردش نے لکھنؤ پہونچا دیا تھا وہیں سو برس کی عمر پا کر ۱۲۲۵ھ مطابق ۱۸۱۰ء میں وفات پائی۔ چھ دیوان مطبوعہ

موجودہ حال میں انجمن ترقی اردو نے کلام میر کا عمدہ انتخاب شائع کیا ہے جس کے ساتھ مولوی عبد الحق صاحب بی۔ اے سکریٹری انجمن کا دلچسپ مقدمہ شامل ہے آپ کا تذکرہ نکات الشعراء بھی جس میں اپنے معاصرین کے حالات درج کئے ہیں طبع ہو چکا ہے بعض کے نزدیک میر صاحب کی پیدائش ۱۱۳۷ھ میں اور انتقال ۱۲۲۵ھ میں ہوا نمونہ کلام یہ ہے :-

(۲۶) غزل

جس سر کو غرور آج ہے یاں تاج وری کا
کل اس پہ یہیں شور ہے پھر نوحہ گری کا

شرمندہ ترے رخ سے ہے رخسار پری کا
چلتا نہیں کچھ آگے ترے کبک دری کا

آفاق کی منزل سے گیا کون سلامت
اسباب لٹا راہ میں یاں ہر سفری کا

زنداں میں بھی شورش نہ گئی اپنے جنوں کی
اب سنگ مداوا ہے اس آشفتہ سری کا

ہر زخم جگر داور محشر سے ہمارا
انصاف طلب ہے تری بیداد گری کا

اپنی تو جہاں آنکھ لڑی پھر وہیں دیکھو
آئینے کو لپکا ہے پریشاں نظری کا

صد موسم گل ہم کو تہ بال ہی گزرے
مقدور نہ دیکھا کبھی بے بال و پری کا

اس رنگ سے جھمکے ہے پلک پر کہ کہے تو
ٹکڑا ہے ترا اشک عقیق جگری کا

کل سیر کیا ہم نے سمندر کو بھی جا کر
تھا دست نگہ پنجۂ مژگاں کی تری کا

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہ شیشہ گری کا

ٹک میر جگر سوختہ کی جلد خبر لے
کیا یار بھروسہ ہے چراغ سحری کا

(۲۷)

کیا کہوں کیسا ستم غفلت سے مجھ سے ہو گیا — قافلہ جاتا رہا میں صبح ہوتے سو گیا

بیکسی مدت تلک برسا کی اپنی گور پر — جو ہماری خاک پر سے ہو کے گزرا رو گیا

کچھ خطرناکی طریق عشق میں پنہاں نہیں — کھپ گیا وہ راہرو اس راہ ہو کر جو گیا

مدعا جو ہے سو وہ پایا نہیں جاتا کہیں — ایک عالم جستجو میں جی کو اپنے کھو گیا

میر ہر اک موج میں ہے زلف ہی کا سا دماغ
جب سے وہ دریا پہ آ کر بال اپنے دھو گیا

(۲۸)

دل عشق کا ہمیشہ حریف نبرد تھا — اب جس جگہ کہ داغ ہے یاں آگے درد تھا

اک گرد راہ تھا پئے محمل تمام راہ — کس کا غبار تھا کہ یہ دنبالہ گرد تھا

دل کی شکستگی نے ڈرائے رکھا ہمیں — واں چیں جبیں پہ آئی کہ یاں رنگ زرد تھا

مانند حرف صفحۂ ہستی سے اٹھ گیا — دل بھی مرا جریدۂ عالم میں فرد تھا

تھا پشتہ ریگ بادیہ اک وقت کارواں — یہ گردباد کوئی بیاباں نورد تھا

گزری مدام اس کی جوانان مست میں — پیر مغاں بھی طرفہ کوئی پیر مرد تھا

(۲۹)

جو اس شور سے میر روتا رہے گا — تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا

مجھے کام رونے سے اکثر ہے ناصح — تو کب تک مرے منہ کو دھوتا رہے گا

مرے دل نے وہ نالہ پیدا کیا ہے		جرس کے بھی وہ ہوش کھوتا رہے گا
	میں وہ رونے والا چلا ہوں جہاں سے جسے ابر ہر سال روتا رہے گا	

(۳۰) قطعہ

کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو آگیا کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر تھا وہ تو رشک حور بہشتی ہم ہی میں میر		یکسر وہ استخوان شکستوں سے چور تھا میں بھی کبھو کسو کا سر پر غرور تھا سمجھے نہ ہم تو فہم کا اپنے قصور تھا

(۳۱) غزل

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماری دل نے آخر کام تمام کیا
عہد جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند
یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا
حرف نہیں جاں بخشی میں اس کی خوبی اپنی قسمت کی
ہم سے جو پہلے کہہ بھیجا سو مرنے کا پیغام کیا
ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا
سارے رندو اوباش جہاں کے تجھ سے سجود میں رہتے ہیں

بانکے ٹیڑھے ترچھے تیکھے سب کا تجھ کو امام کیا

سرزد ہم سے بے ادبی تو وحشت میں بھی کم ہی ہوئی
کوسوں اس کی اور گئے پر سجدہ ہر ہر گام کیا

کس کا کعبہ کیسا کلیسا کون حرم ہے کیا احرام
کوچے کے اس کے باشندوں نے سب کو یہیں سے سلام کیا

شیخ جو ہے مسجد میں ننگا رات کو تھا مے خانے میں
جبہ خرقہ کرتا ٹوپی مستی میں انعام کیا

کاش اب برقع منہ سے اٹھا دے ورنہ پھر کیا حاصل ہے
آنکھ مندے پر ان نے گو دیدار کو اپنے عام کیا

یاں کے سپید و سیاہ میں ہم کو دخل جو ہے سو اتنا ہے
رات کو رو رو صبح کیا یا دن کو جوں توں شام کیا

صبح چمن میں اس کو کہیں تکلیف ہوا لے آئی تھی
رخ سے گل کو مول لیا قامت سے سرو غلام کیا

ساعدِ سیمیں دونوں اس کے ہاتھ میں لا کر چھوڑ دیئے
بھولے اس کے قول و قسم پر ہائے خیالِ خام کیا

کام ہوئے ہیں سارے ضائع ہر ساعت کی سماجت سے
استغنا کی چوگنی ان نے جون جون میں ابرام کیا

ایسے آہوئے رم خوردہ کی وحشت کھونی مشکل تھی
سحر کیا اعجاز کیا جن لوگوں نے تجھ کو رام کیا

میرؔ کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو ان نے تو
قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

(۱۳)

پتا پتا بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

لگنے نہ دے بس ہو تو اس کے گوہر گوش کو بالے تک
اس کو فلک چشم مہ و خور کی پتلی کا تارا جانے ہے

آگے اس متکبر کے ہم خدا خدا کیا کرتے ہیں
کب موجود خدا کو وہ مغرور خود آرا جانے ہے

عاشق سا تو سادہ کوئی اور نہ ہوگا دنیا میں
جی کے زیاں کو عشق میں اس کے اپنا وارا جانے ہے

چارہ گری بیماری دل کی رسم شہر حسن نہیں
ورنہ دلبر ناداں بھی اس درد کا درماں جانے ہے

کیا ہی شکار فریبی پر مغرور ہے وہ صیاد بچہ
طائر اڑتے ہوا میں سارے اپنا اتارا جانے ہے

مہر و وفا و لطف و عنایت اک سے واقف ان میں سے
اور تو سب کچھ طنز و کنایہ رمز و اشارا جانے ہے

عاشق تو وہ مردہ ہے ہمیشہ اٹھتا ہے دیکھے سو اس کے
یار کے آ جانے کو یکایک عمر دوبارا جانے ہے

کیا کیا آفتیں سر پر اس کے لاتا ہے معشوق اپنا
جس بے دل بے تاب و تواں کو عشق کا مارا جانے ہے

رخنوں سے دیوار چمن کے منہ کو لے ہے چھپا یعنی
ان سوراخوں کے ٹک رہنے کو سو کا نظارا جانے ہے

قطعہ: تشنۂ خوں ہے اپنا کتنا میر بھی ناداں تلخی کش
دمدار آبِ تیغ کو اس کے آبِ گوارا جانے ہے

(۸) جرأت ۱۸۱۰ء

(شیخ قلندر بخش) دہلوی بذلہ سنج لطیفہ گو معاملہ بند شاعر تھے۔ سلیمان شکوہ نواب اودھ کی ملازمت میں داخل تھے عالم شباب میں بینائی جاتی رہی تھی، طبیعت کو رنگ تغزل سے ایک خاص مناسبت تھی حسن و عشق کے واقعات اور عاشق و معشوق کے راز و نیاز ان کی شاعری کا جزو اعظم ہیں علمی استعداد کم تھی بلکہ صاحب تذکرہ آب حیات نے یہاں تک لکھ دیا ہے کہ عربی زبان سے نابلد تھے سنہ ۱۸۱۰ء مطابق

سنہ ۱۲۲۲ھ لکھنؤ میں وفات پائی۔ بعض غزلیات میں ایک ہی مضمون لکھا ہے۔ ایک موقعہ پر اپنے دل سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں:-

(۳۳) غزل

اے دلا ہم ہوئے پابندِ غمِ یار کہ تو
اب اذیت میں بھلا ہم ہیں گرفتار کہ تو

ہم تو کہتے تھے نہ عاشق ہو اب اتنا تو بتا
جا کے ہم پیٹتے ہیں پھر دلا پس دیوار کہ تو

ہاتھ کیوں عشقِ بتاں سے نہ اٹھایا تو نے
کفِ افسوس ہم اب ملتے ہیں ہر بار کہ تو

نہیں تحمل ہے وہی لوگ وہی ہے چرچا
اب بھلا بیٹھے ہیں ہم شکل گنہگار کہ تو

ہم تو کہتے تھے کہ لب سے نہ لگا ساغرِ عشق
مئے اندوہ سے اب ہم ہوئے سرشار کہ تو

اے جگر جی کا پھنسانا تجھے کیا تھا درکار
طعن و تشنیع کے اب ہم ہیں سزاوار کہ تو

وحشتِ عشق بری ہوتی ہے دیکھا اول
ہم چلے دشت کو اب چھوڑ کے گھر بار کہ تو

آتشِ عشق کو سینے میں عبث بھڑکایا
اب بھلا کھینچتے ہیں آہ شرربار کہ تو

ہم تو کہتے تھے نہ ہمراہ کسی کے لگ چل
اب بھلا ہم ہوئے رسوا سرِ بازار کہ تو

غور کیجے تو یہ مشکل ہے زمیں اے جرأت
دیکھیں ہم اس میں کہیں اور بھی اشعار کہ تو

(۳۴)

میرے ہونے کو تو کچھ گرمئ بازار نہیں
میں ہوں وہ جنس کہ کوئی جس کا خریدار نہیں

دل تو اٹھتا ہے یہ حسرت ہے میں کیونکر روؤں
لبِ تصویر کو گریہ سے سروکار نہیں

درد کیا جانئے کیا کیا یہ بیاں کرتا ہے تیرے بیمار سا بیمار نہ ہوگا کوئی	دہن زخم کو گویا لب گفتار نہیں جس کو ظاہر میں جو دیکھو تو کچھ آزار نہیں

(۲۷)

غیر کو تم نہ آنکھ بھر دیکھو دیکھنا زلف و رُخ نہیں ہر وقت	کیا غضب کرتے ہو ادھر دیکھو شام دیکھو نہ تم سحر دیکھو

(۹) انشا ۱۸۱۷ء

سید انشاء اللہ خاں دہلوی۔ نواب سعادت علی خاں بادشاہ اودھ کی مصاحبت میں داخل تھے ان کی جامعیت اور علمی قابلیت کم نہ تھی مگر لکھنؤ کا رنگ دیکھ کر ظرافت پر اُتر آئے تھے پھر بھی ان کے کلام میں جدت اور انداز بیان کا خاص لطف پایا جاتا ہے اُردو زبان میں سب سے پہلے صرف ونحو کے قواعد منضبط کئے۔ دریائے لطافت جس کی زبان فارسی ہے اس کی مصنفہ ہے اپنے رنگ کی پہلی کتاب ہے جس میں عروض معانی وبیان سب کچھ موجود ہے یہ کتاب حال میں انجمن ترقی اُردو کے زیر نگرانی اُردو میں شائع ہوئی ہے حضرت انشاء کی کلیات علم ادب کا عجائب خانہ ہے جس میں دیوان ریختہ دیوان ریختی پہیلیاں طلسمات کے نسخے پشتو کے قواعد۔ مثنویات۔ گرمی کی شکایت کھٹملوں پسوؤں کے بیانات حکایتیں معمے چیستاں شامل ہیں جو ان کی خداداد ذہانت اور علمی قابلیت کا ثبوت پیش کرتی ہیں۔ کوئی ایسا رنگ نہیں جو کلام میں موجود

نہ ہو ۱۲۳۳ھ مطابق ۱۸۱۷ء میں وفات پائی۔ نمونہ کلام یہ ہے :-

غزل (۳۵)

مجھے رونا آتا ہے شمع سحر پر
کہ بیچاری اب مستعد ہے سفر پر

اجی! کیوں رلاتے ہو مجکو تمھیں کیا
نہیں رحم آتا مری چشم تر پر

یہی ڈھنگ ہے تو مجھے کھوئیے گا
پڑے پھریئے گا ہاتھ رکھے کمر پر

اجی جی میں ہے اب کہیں بیٹھ رہیئے
بس اک باندھ تکیہ کسی رہ گزر پر

جنوں سے اگر آشنائی ہوئی تو
مطول کو دے مار تو مختصر پر

کچھ اک صاف صاف ایسے لکھ شعر انشاء
کہ وہ ماریں چشمک صفائے گہر پر

(۳۶)

کمر باندھے ہوئے چلنے پہ یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

نہ چھیڑ اے نکہت بادِ بہاری راہ لے اپنی
تجھے اٹھکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

خیال ان کا پرے ہے عرشِ اعظم سے کہیں ساقی
غرض کچھ اور دھن میں اس گھڑی میخوار بیٹھے ہیں

بسانِ نقش پائے رہرواں کوئے تمنا میں

نہیں اٹھنے کی طاقت کیا کہیں لاچار بیٹھے ہیں

یہ اپنی چال ہے افتادگی سے ان دنوں پہروں
نظر آیا جہاں پر سایۂ دیوار بیٹھے ہیں

کہیں ہیں صبر کس کو! آہ! ننگ و نام کیا شے ہے
غرض رو پیٹ کر ان سب کو ہم اک بار بیٹھے ہیں

نجیبوں کا عجب کچھ حال ہے اس دور میں یارو
جسے پوچھو یہی کہتے ہیں ہم بیکار بیٹھے ہیں

نئی یہ وضع شرمانے کی سیکھی آج ہے تم نے
ہمارے پاس صاحب ورنہ یوں سو بار بیٹھے ہیں

کہاں گردش فلک کی چین دیتی ہے بھلا انشاء
غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

(۴۷)

مجھے کیوں نہ آوے ساقی نظر آفتاب الٹا
کہ پڑا ہے آج خم میں قدحِ شراب الٹا

عجب الٹے ملک کے ہیں اجی آپ بھی کہ تم سے
کبھی بات کی جو سیدھی تو ملا جواب الٹا

چلے تھے حرم کو رہ میں ہوئے اک صنم کے عاشق
نہ ہوا ثواب حاصل یہ ملا عذاب الٹا

یہ شب گزشتہ دیکھا وہ خفا سے کچھ ہیں گویا
کہیں حق کرے کہ ہووے یہ ہمارا خواب الٹا

ابھی جھڑ لگا دے بارش کوئی مست بے تحاشا
جو زمیں پہ پھینک مارے یہ قدح شراب الٹا

یہ عجب ماجرا ہے کہ بروزِ عید قرباں	وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب الٹا
ہوئے وعدہ پر جب جھوٹے تو نہیں ملاتے تیور	لے یہ دیکھو کچھ تماشا یہ سنو عتاب الٹا
کھڑے چپکے دیکھتے کیا مرے دل اجڑ گئی کو	وہ گنہ تو کہہ کے جس سے یہ ہوا خراب الٹا

غزل اور قافیوں میں کہے تو کیونکر انشاء
کہ ہوا نے خود بخود آ۔ ورق کتاب الٹا

(۱۰) مصحفی سنہ ۱۸۲۴ء

شیخ غلام ہمدانی امروہہ ضلع مراد آباد کے شیخ زادگان سے تھے عنفوان شباب میں طالب علمی کرنے دہلی آئے اور پھر وہیں سکونت اختیار کر لی آصف الدولہ کے عہد میں لکھنؤ پہنچے میرزا سلیمان شکوہ کی ملازمت کے زمانہ میں سید انشاء سے مقابلے ہوئے کسی کے شاگرد نہ تھے مگر زبان میں سودا اور میر کی پیروی کرتے تھے فارسی میں بھی صاحب دیوان تھے اردو میں چھ دیوان تصنیف کئے تھے مشکل زمینوں میں عمدہ شعر نکال لیتے تھے سنہ ۱۸۲۴ء ۱۲۴۰ھ میں وفات پائی۔ نمونہ کلام یہ ہے:-

غزل (۲۸)

لاف خوبی تم سے عارض پہ جو گلشن مارے	آتش رخ پہ صبا لیس کو دامن مارے
کیا غضب ہے جو تو غرفے میں کھلے بال پھرے	اور نظارہ ترا دیدۂ روزن مارے
ہر بہ خیال انکھوں کا جو تیرے کوچہ میں	خاک نشین ہے کوئی بیٹھے میں آسن مارے

دشمن و دوست کو اُلفت نے تری ایک کیا
ہاتھ پر ہاتھ نہ کیوں شیخ و برہمن مارے

ہم ترے واسطے ای غیرت لیلیٰ کب تک
قیس کی طرح پڑے پھرتے ہیں بن بن مارے

وہ جو آنکھیں ہیں تری رہزن و خونیں کافر
قافلے لوٹ لیے سیکڑوں رہزن مارے

ضبط سے مصحفی اب کام مرا درگزرا
کب تلک غم میں کسی کے کوئی تن من مارے

(۳۸)

گرے جو اُس کی نظر سے تو پھر کہاں کے ہوئے
نہ ہم زمیں کے ہوئے اور نہ آسماں کے ہوئے

قفس میں جھانک ہی لیویں گے گل کو ایک برس
جو رخنے بند نہ دیوار گلستاں کے ہوئے

ہو جائے شکر کہ ناکشتنی یہ ہم سے لوگ
تری گلی میں سزاوار امتحاں کے ہوئے

عجب نہیں ہے کہ بلبل کو ہووے نشو و نما
کہ اس ہوا میں ہرے خار آشیاں کے ہوئے

نظر سے ناقۂ لیلیٰ یہ ہو گیا غائب
کہ لوگ ہر طرف آوارہ کارواں کے ہوئے

متاعِ حسن کے تودے لگے جہاں دیکھو
ہم ایک بار خریدار اُس دوکاں کے ہوئے

ہزار شکر کہ اُن گلرخوں کی مجلس میں
گئے جو ہم تو نہ شرمندہ برگِ پاں کے ہوئے

گلی میں اُس کی جو ہم مر گئے تو بعد مرگ
سگ و ہما میں کئی حصے استخواں کے ہوئے

بلیغ دہر ہے اے مصحفی تو لاشک و ریب
جو تھے فصیح وہ بندے تری زباں کے ہوئے

(۱۱) نظیر ۱۸۳۰ء

ولی محمد اکبر آبادی بزرگوں کا اصلی وطن شاہجہان آباد تھا دھلی کی تباہی اور بربادی کے بعد اکبر آباد آئے اور روضۂ تاج گنج کے قریب سکونت اختیار کی معلمی کا پیشہ کرتے تھے شاعری میں وہ کسی کے شاگرد نہ تھے ان کے کلام میں قدرت کے مناظر کی جھلک پائی جاتی ہے۔ ہندوستان کے میلوں ٹھیلوں، آزاد فقیروں کے مجمعوں، پرتکلف مجالس، اور بے تکلف ٹولیوں میں ان کی نظموں کو مزے لیکر پڑھا جاتا ہے روزمرہ کے محاورات ہر موقع و محل کی اصطلاحات صاف اور سیدھی زبان میں لکھتے تھے یہ روایت بھی مشہور ہے کہ شاہ اودھ نے ان کو معقول تنخواہ دینے کا وعدہ کیا تھا اور لکھنؤ بلایا تھا مگر وہ آگرہ کی حدود سے باہر نہ نکلے ۱۶ اگست ۱۸۳۰ء مطابق ۶ صفر ۱۲۴۶ھ کو آگرہ میں انتقال کیا تاج گنج میں دفن ہوئے کلیات نظیر قدیم کے علاوہ اس کا ایک جدید اڈیشن اعلیٰ پیمانہ پر نولکشور پریس لکھنؤ نے شائع کیا ہے اور پروفیسر شہباز نے ان کی مبسوط سوانح عمری جس میں کلام پر تنقید بھی کی گئی ہے۔ زندگانی بے نظیر کے نام سے لکھی ہے جو مطبع مذکور میں چھپی ہے۔ آخر میں ان کے منتخب کلام کا مجموعہ مخمور صاحب اکبر آبادی نے مع فرہنگ و حواشی آگرہ اخبار پریس میں چھپوایا ہے جس میں مخمور صاحب کا مقدمہ اور تبصرہ بھی شامل ہے۔

کلام کا انتخاب یہ ہے

(۳۹) برسات کا تماشا

ساون کی کالی راتیں اور برق کے اشارے
لپٹے گلے سے سوتے معشوق ماہ پارے
جگنوں چمکتے پھرتے جوں آسماں پہ تارے
گرتی ہے چھت کسی کی کوئی کھڑا پکارے

آ یار چل کے دیکھیں برسات کا تماشا

ہاتھوں میں ہیں ہر اک کے بھونگی لال چھڑیاں
گل بوٹوں کے جوڑے پہ بوندیں ہیں مینہ کی جھڑیاں
بجلی چمکتی پھرتی اور لگ رہی ہیں جھڑیاں
ہر سیل میں ہیں ہزاروں اب موتیوں کی لڑیاں

آ یار چل کے دیکھیں برسات کا تماشا

(۴۰) تاج گنج

یارو جو تاج گنج یہاں آشکار ہے
خوبی میں سب طرح کا اسے اعتبار ہے
ایسا چمک رہا ہے تجلّی سے یہ مکاں
ایسا ہلال جس میں سنہرا ہے دل پسند
مشہور اس کا نام یہ شہرہ دیار ہے
روضہ جو اس مکان میں دریا کنار ہے
جس سے بلور کی بھی چمک شرمسار ہے
ہر بار جس کے خم یہ مہ نو نثار ہے

تعریف اس مکان کی میں کیا کیا کروں نظیر
اس کی صفت تو مشتہر روزگار ہے

(۴۱) بنجارے نامہ

ٹک حرص و ہوا کو چھوڑ میاں مت دیس بدیس پھرے مارا
قزاق اجل کا لوٹے ہے دن رات بجا کر نقارا
کیا بدھیا بھینسا بیل شتر کیا گونیں پلا سر بھارا
کیا گیہوں چانول موٹھ مٹر کیا آگ دھواں اور انگارا

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

گر تو ہے لکھی بنجارا اور کھیپ بھی تیری بھاری ہے
اے غافل تجھ سے بھی چڑھتا اک اور بڑا بیوپاری ہے
کیا شکر مصری قند گری کیا سانبھر میٹھا کھاری ہے
کیا داکھ منقے سونٹھ مرچ کیا کیسر لونگ سپاری ہے

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

تو بدھیا لادے بیل بھرے جو پورب پچھم جاوے گا
یا سود بڑھا کر لاوے گا یا ٹوٹا گھاٹا پاوے گا
قزاق اجل کا رستے میں جب بھالا مار گراوے گا
دھن دولت ناتی پوتا کیا اک کنبہ کام نہ آوے گا

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

ہر منزل میں اب ساتھ ترے یہ جتنا ڈیرا ڈانڈا ہے
زر دام درم کا بھانڈا ہے بندوق سپر اور کھانڈا ہے
جب نایک تن کا نکل گیا جو ملکوں ملکوں ہانڈا ہے
پھر ہانڈا ہے نہ بھانڈا ہے نہ حلوا ہے نہ مانڈا ہے

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

جب چلتے چلتے رستے میں یہ گون تری ڈھل جاوگی
اک بدھیا تیری مٹی پر پھر گھاس نہ چرنے پاوگی
یہ کھیپ جو تو نے لادی ہے سب حصوں میں بٹ جاوگی
دھی پوت جنوائی بیٹا کیا بنجارن پاس نہ آوگی

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

یہ کھیپ بھرے جو جاتا ہے یہ کھیپ میاں مت گن اپنی
اب کوئی گھڑی پل ساعت میں یہ کھیپ بدن کی ہے کفنی
کیا تھال کٹوری چاندی کی کیا پیتل کی ڈبیا ڈھکنی
کیا برتن سونے چاندی کے کیا مٹی کی ہنڈیا اپنی

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

یہ دھوم دھڑکا ساتھ لیے کیوں پھرتا ہے جنگل جنگل
اک تنکا ساتھ نہ جاوے گا موقوف ہوا جب ان اور جل

گھر بار اٹاری چوپاری کیا خاصہ نین سکھ اور ململ
کیا چلون پردے فرش نئے کیا لال پلنگ اور رنگ محل
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

کچھ کام نہ آویگا تیرے یہ لعل و زمرد سیم و زر
جب پونجی باٹ میں بکھرے گی ہر آن بنے گی جان اوپر
نوبت نقارے بان نشان دولت حشمت فوجیں لشکر
کیا مسند تکیہ ملک مکاں کیا چوکی کرسی تخت چھپر
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

کیوں جی پر بوجھ اٹھاتا ہے ان گونوں بھاری بھاری کے
جب موت کا ڈیرا آن پڑا پھر دونے ہیں بیوپاری کے
کیا ساز جڑاؤ زر زیور کیا گوٹے تھان کناری کے
کیا گھوڑے زین سنہری کے کیا ہاتھی لعل عماری کے
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

مغرور نہ ہو تلواروں پر مت پھول بھروسے ڈھالوں کے
سب پٹا توڑ کے بھاگیں گے منہ دیکھ اجل کے بھالوں کے
کیا ڈبے موتی ہیروں کے کیا ڈھیر خزانے مالوں کے
کیا بقچے تاش مشجر کے کیا تختے شال دوشالوں کے
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

کیا سخت مکاں بنواتا ہے کھم تیرے تن کا ہے پولا
تو اونچے کوٹ اٹھاتا ہے واں گور گڑھے نے منہ کھولا
کیا رینی خندق رند بڑے کیا برج کنگورا انمولا
گڑھ کوٹ رہکلہ توپ قلعہ کیا شیشہ دارو اور گولا
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

ہر آن نفع اور ٹوٹے میں کیوں مرتا پھرتا ہے بن بن
ٹک غافل دل میں سوچ ذرا ہے ساتھ لگا تیرے دشمن
کیا لونڈی باندی دائی دوا کیا بندا چیلا نیک چلن
کیا مندر مسجد تال کنویں کیا کھیتی باڑی پھول چمن
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

غوغائی بگیری دلٹورے نہ پپیہے	کچھ لال چڑے پودنے پدے ہی نہ غش تھے

پدنی بھی سمجھتی تھی اُسے آنکھ کا تارا

چاہت کے گرفتار بٹیریں لوے تیتر | لگلگیں نے ہاریلوں نے بھی چاہت میں بندھے پر
ہاریل بھی ہوئے ہٹ کے تو بھلا ادھر اور ادھر | زاغ و زغن و طوطی و طاؤس کبوتر

سب کرنے لگے اُس کی محبت کا اشارہ

شکل اُس کی وہیں جی میں کھبی شام جو آئے | وہی چاہ جتا پھر سے چھپانیوں نے بھی جھپٹے
ہریل بھی ہوئے اس کے بہت چاہنے والے | جتنے غرض اُس پیڑ پہ رہتے تھے پرندے

اُس ہنس پہ ان سب نے دل و جان کو وارا

خواہش یہ ہوئی سب کی کہ ہر دم اُسے گھیریں | اور اُس کی محبت سے ذرا منہ کو نہ پھیریں
دن رات اُسے خوش رکھیں نت سکھ اُسے دیویں | صحبت جو ہوئی ہنس کی اُن جانوروں میں

یک چند رہا خوب محبت کا گزارا

سب ہو کے خوش اُس کی مئے الفت لگے پینے | اور پیت سے ہر اک نے وہاں بھر لئے سینے
ہر آن جتانے لگے چاہت کے قرینے | اُس ہنس کو جب ہو گئے دو چار مہینے

اک روز وہ یاروں کی طرف دیکھ پکارا

یاں لطف و کرم تم نے کئے ہم پہ ہیں جو جو | تم سب کی یہ خوبی ہی کہاں ہم سے بیاں ہو
تقصیر کوئی ہم سے ہوئی ہووے تو بخشو | اے یارو ہم اب جاوینگے کل اپنے وطن کو

اب تم کو مبارک رہے یہ پیڑ تمہارا

اب تک تو بہت ہم پہ ہے فرصت ہم آغوش
جب حرف جدائی کا پرندوں نے کیا گوش
اب یادِ وطن دل کی ہمارے ہوئی ہمدوش
اس بات کے سنتے ہی جو ہر اک کے اڑے ہوش
سب بولے یہ فرقت تو نہیں ہم کو گوارا

بن دیکھے تمہارے ہمیں کب چین پڑینگے
گر تم نے یہ ٹھہرائی تو کیا سکھ سے رہیں گے
اک آن نہ دیکھیں گے تو دل غم سے بھرینگے
ہم جتنے ہیں سب ساتھ تمہارے ہی چلیں گے
یہ درد تو اب ہم سے نہ جائے گا سہارا

پھر ہنس نے یہ بات کہی اُن سے کئی بار
آنکھیں ہوئیں اشکوں سے پرندوں کی گہربار
کچھ بس نہیں اب چلنے کی ساعت ہے ہیں ناچار
اتنے میں جو شب گذری ہوئی صبح نمودار
پر اپنا ہوا پر وہیں اس ہنس نے مارا

وہ ہنس جب اُس پیڑ سے واں کو چلا ناگاہ
دیکھا جو اُسے جاتے ہوئے واں سے تو کر آہ
منہ پھیر کے یا پھر سے وطن کی جھٹ لی راہ
سب ساتھ چلے اُس کے وہ ہمراہ ہوا خواہ
ہر ایک نے اُڑنے کے لئے پنکھ پسارا

اور ہنس کی اُن سب کو رفاقت ہوئی غالب
کلفت تھی جو فرقت کی وہ سب پہ رہی غالب
جب واں سے چلا وہ تو ہوئی بے بسی غالب
دو کوس اُڑے تھے جو ہوئی ماندگی غالب
پھر پر میں کسی کے نہ رہا قوت و یارا

پر ان کے نئے تھے نہیں دوری کی پڑی اوس
تھک تھک کے لگے کرنے تو کرنے لگے افسوس
ڈرتے کہ رفاقت کی کریں کیونکہ قدم بوس
کوئی تین کوئی چار کوئی پانچ اڑا کوس

شہیدی سے نہیں واقف مگر اتنا تو واقف ہے
کہ راتوں کو کوئی کرتا ہوا ماتم نکلتا ہے

(۱۳) ناسخ ۱۸۳۸ء

شیخ امام بخش نام۔ اصلی وطن لاہور تھا۔ فیض آباد میں تعلیم پائی تھی فارسی کے ماہر تھے اردو زبان کی تلاش خراش اور نبایشوں کی جستجو اور تعقیبات کا دور کرنا یہ سب ان کی ایجاد ہیں۔ اُنھوں نے اُردو شاعری کو نیا جامہ پہنا دیا تھا اُن کا اعلیٰ ترین پایۂ تحقیق اور اُن کی اُستادی مسلّم ہے اُنھوں نے اپنے کلام میں دیگر شعرائے لکھنؤ کی طرح مبالغہ اور تشبیہات سے زیادہ کام لیا ہے لیکن اس کو اس طرح نبھایا ہے کہ اس سے کلام کا زور گھٹنے نہیں پایا ہے اُن کی اُستادی بہ ہمہ حال ہے چونسٹھ پینسٹھ برس کی عمر پا کر ۱۲۵۴ھ (۱۸۳۸ء) میں دُنیا کو خیرباد کہی۔ کلیات ناسخ مطبوع خاص و عام ہے۔ نمونہ کلام یہ ہے:-

(۴۳) غزل

جو دل ہی ٹوٹ گیا کیا ہوں شعرِ تر پیدا
ہوئے ہیں شاخِ شکستہ سے کب ثمر پیدا

وہ نخلِ باغِ جہاں ہیں ہم کہ ہوتی ہے
ہر ایک شاخ پہ دستۂ تبر پیدا

کیا ہے آتشِ غم نے مرا یہ خشک لہو
کہ مثلِ سنگ رگوں میں ہوئے شرر پیدا

شگفتہ غنچہ نہ جب تک ہو بو نہیں آتی
ہو چاک چاک اگر دل تو ہو اثر پیدا

جنہیں حسین وہ مفلس کبھی نہیں رہتے
گلو کے ساتھ ہی ہوتا ہے زر پیدا

میں بے خبر ہوں مگر ہے جنونِ عشق نہاں — ہوئے ہیں داغ چھپانے کو ہوئے ہیں پیدا
یہ رنگت اُس کی سُنہری ہے گر نہائے کبھی — نیا رہیئے کریں حمام سے بھی زر پیدا
نہ داغ یاس سے گھبراہٹ آئے گی اُمید — گلوں کے لیے ہوا کرتے ہیں ثمر پیدا
بلائے چشم نہ حسن اور نہ نغمہ آفتِ گوش — کریں وہ چین ہوئے ہیں جو کور و کر پیدا

غزل (۴۴)

مرا سینہ ہے مشرق آفتابِ داغِ ہجراں کا — طلوعِ صبحِ محشر چاک ہے میرے گریباں کا
کسی خورشید رو کو جاذبِ دل نے آج کھینچا ہے — کہ نورِ صبحِ صادق ہے غبار اپنے بیاباں کا
شفق سمجھا ہے اُس کو ایک عالم دائے بیداد کی — فلک پر گر بگولا جا لگا خاکِ شہیداں کا
سیہ خانہ مرا روشن ہوا ویران ہونے سے — کیا دیوار کے رخنوں نے یاں عالم چراغاں کا
نہ شوخِ فتنہ انگیز اپنی آنکھوں میں سمایا ہے — کہ اک گوشہ ہے صحرائے قیامت جس کے داماں کا
کفن کی جیبِ سفید ہی دیکھتا ہوں کنج مرقد میں — تو عالم یاد آتا ہے شبِ مہتابِ ہجراں کا
مرا ویرانہ مثلِ آئینہ معمورِ حیرت ہے — یقیں ہر رخنۂ دیوار پر ہے چشمِ حیراں کا
کسی سے دل نہ اُس وحشت سرا میں سے نکالا — نہ اُلجھا خار ہے دامن کبھی میرے بیاباں کا

تہِ شمشیرِ قاتل کس قدر بشاش تھا ناسخ
کہ عالم ہر دہانِ زخم پر ہے روئے خنداں کا

(۴۵)

یہ نور ہے روئے مہ جبیں کا۔ کہ ہو خجل چاند چودھویں کا

جو حلقہ ہو زلف عنبریں کا۔ وہ ایک نافہ ہو مشک چیں کا
یہ اُس کی ہو ساعدوں کا عالم۔ کہ جس نے دیکھیں ہوا وہ بیدم
نیام ہو تیغ قضائے مبرم۔ لقب ہو قاتل کی آستیں کا
یہ جوشش پر یاں ہو اشک کا یم۔ کہ یاقوت ریاہیں قطرے ہو کم
جسے کہ کہتے ہیں سیل جہنم۔ شرر ہو اک آہ آتشیں کا
بُرا ہو بدبخت عاشقی کا۔ نہ دین ہو برباد یوں کسی کا
بنا ہو عشق بتاں ہیں ٹیکا۔ نشان سجدہ مری جبیں کا

طمع ہو انصاف دوستاں سے کہ آشنا فرمائیں سب زباں سے کیا ہو ناسخ نے آسماں سے۔ بلند تر رتبہ اس زمیں کا

(۱۴) میر ممنون سنہ ۱۸۴۷ء

میر نظام الدین۔ سید قمر الدین خاں منت دہلوی کے بیٹے اور شاگرد تھے اُردو فارسی دونوں زبانوں ہیں شعر کہتے تھے خود ان کے قلم کا لکھا ہوا دیوان کتب خانہ آصفیہ ہیں موجود ہے۔ اکبر شاہ ثانی کا زمانہ دیکھا تھا عہد انگریزی ہیں اجمیر کے صدر الصدور تھے سنہ ۱۲۵۴ھ مطابق سنہ ۱۸۴۷ء ہیں انتقال ہوا۔ کلام کا انتخاب یہ ہے:۔

(۴۶) غزل

ہمر سنر تخم دوستی ہووے بغیر دل کہاں	بالے بزیر آسمان اپنا تہ بیبا کہاں

طاقت سے ہم چل بسے پر بزم خالی دیکھ کے
چھپ رہا ہوں خوف سے کچھ اور تو واقف نہیں
بحر حوادث کا یہ شور یا مخالف کا وہ دور
کشتی سینہ کا ہر تختہ لگ دیکھو اک نقطہ دار
ناوک یک نیم سا دل کا بیر خطر کوئی نہ یار و رہبر
ما ہمت ہم ہیں اور نہ قفس ای ہم صفیر و کیا خبر
سو بار ہم ہیں کہہ چکا خوب ہے مت مل ہی بڑا
تشنہ بھی ہو ساقی بھی ہو شمع بھی ہو یا رہتی ہے

اس نے پوچھا ایک دن آج نہ پہنا کہاں
مفتون ہی کس پر ہوا دل ہو گیا مائل کہاں
کشتی کھینچی ہی موجوں میں ٹوٹا تھا آئے اب ساحل کہاں
اس سے قضا نے دام سے رخ پہنایا تل کہاں
بھیس کہ مجھ سر گشتہ میں اب منزل کہاں
غنچے کدھر کو ہیں اگر گل رہ گئے ہیں کل کہاں
لیکن سمجھتا ہی بھلا اپنا دل جاہل کہاں
وہ خوبی مجلس کہاں نہ رونق محفل کہاں

کچھ عقدہ مشکل کا تو ممنون ناخن پیشہ نہ کر
مشکل کشا جیسا ہر یہ ہو رہتی ہے پھر مشکل کہاں

(۵۱) آتش سنہ ۱۸۴۷ء

آتش خواجہ حیدر علی ولد خواجہ علی بخش دہلوی سنہ ۱۷۶۷ء (۱۱۸۱ھ) میں بمقام لکھنؤ پیدا ہوئے وہیں تعلیم و تربیت حاصل کی۔ ان کے والد نے لکھنؤ میں سکونت اختیار کر لی تھی خواجہ صاحب نہایت آزاد مزاج متوکل طبع شاعر تھے فن سخن میں شیخ غلام ہمدانی مصحفی سے تلمذ حاصل تھا شیخ ناسخ کے ہمعصر تھے سلاست زبان اور صفائی کلام نے لکھنؤ میں ان کی جادو بیانی کے ڈنکے بجا دیئے تھے غزل میں حسن و عشق کے علاوہ اخلاقی مضامین بھی لکھے تھے سنہ ۱۲۶۳ھ مطابق سنہ ۱۸۴۷ء میں انتقال کیا

کلیات آتش جس میں دو دیوان ہیں ہر جگہ دستیاب ہوتی ہے۔ نمونہ کلام یہ ہے:

(۴۹)

حسن پری اک جلوۂ مستانہ ہے اُس کا
ہشیار وہی ہے کہ جو دیوانہ ہے اُس کا

گل آتے ہیں ہستی میں عدم سے ہمہ تن گوش
بلبل کا یہ نالہ نہیں افسانہ ہے اُس کا

جب چشم کہ حیران ہوئی آئینہ ہے اُس کی
جو سینہ کہ صد چاک ہو شانہ ہے اُس کا

وہ یاد ہے اُس کی کہ بھلا دے دو جہاں کو
حالت کو کرے غیر وہ یارانہ ہے اُس کا

یوسف نہیں جو ہاتھ لگے چند درم سے
قیمت جو دو عالم کی ہے بیعانہ ہے اُس کا

آوارگی نکہت گل ہے یہ اشارہ
جامے سے جو باہر ہے وہ دیوانہ ہے اُس کا

شکرانۂ ساقی ازل کرتا ہے آتش
لبریز ہے شوق سے پیمانہ ہے اُس کا

(۵۰)

خار مطلوب جو ہو دے تو گلستاں مانگوں
بجلی گرنے کو جو جی چاہے تو باراں مانگوں

خاک میں بھی جو ملوں میں تو کبھی صحرا میں
تم سے ہٹ بھی نہ ای گبرو مسلماں مانگوں

بادشاہی سے فقیری کا ہے پایہ بالا
بوریا چھوڑ کے کیا تخت سلیماں مانگوں

مجھ سے عشق کے ہے راحت دنیا بے تر
زخم خنداں ہو اگر میں گل خنداں مانگوں

پاس حرماں نہ ہو لوہے کے چنے بھی تو چباؤں
نعمت عشق کے قابل لب دنداں مانگوں

ملتی ہو مانگنے سے باغ جہاں میں جو مراد
گل سے بلبل کے کفن کیلئے داماں مانگوں

جامۂ جسم بھی رکنے کا نہیں دستِ جنوں	پیرہن خاک ہیں دیوانہ عریاں مانگوں
بخت وارونے زباں کو یہ اثر بخشا ہے	تلخی مرگ مزہ دے جو نمک داں مانگوں

کب سے در پر ترے سائل ہوں میں آتش کی طرح
وہ ملے مجھ کو جو کچھ اے شہِ خوباں مانگوں

(۱۶) گویا ۱۸۴۹ء

نواب فقیر محمد خاں گویا واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کا زمانہ پایا تھا صاحب دیوان تھے ان کا دیوان ۱۲۴۲ھ میں مرتب ہو چکا تھا لیکن اس کے طبع کی نوبت ان کی وفات کے بعد آئی سب سے پہلی مرتبہ اس کو ۱۸۸۳ء میں مطبع نولکشور نے کانپور میں چھاپا تھا ۱۸۴۹ء مطابق ۱۲۶۶ھ میں انتقال ہوا۔ غزل کا نمونہ ملاحظہ ہو:۔

(۵۱) غزل

پھر یہ دل شیفتۂ زلف پریشاں ہوگا	پھر مرا جوشِ جنوں سلسلہ جنباں ہوگا
اے جنوں پھر مجھے خوش آنے لگی عریانی	پھر نہ دامن ہی رہے گا نہ گریباں ہوگا
پھر بہار آئی ہوا جوشِ جنوں پھر مجھ کو	چاک پھر گل کی روش میرا گریباں ہوگا
پھر ہوا شوقِ شہادت مجھے پھر شاید ہوگا	پھر گلا میرا تہہ خنجرِ بُرّاں ہوگا
پھر لگی لالہ رخوں سے مجھے الفت ہونے	سینہ پھر داغوں سے اپنا گلستاں ہوگا
پھر چلیں گے تماشے کو گلزار میں	پھر ہر اک سروِ چمن سروِ چراغاں ہوگا

پھر ترے قد کا خیال آنے لگا گلشن میں
نخل ماتم مجھے پھر سرو گلستاں ہوگا

پھر کسی آئینہ رخسار سے الفت ہوگی
صورت آئینہ پھر دل مرا حیراں ہوگا

چاہ پھر تیری جھکائے گی کنوئیں اے یوسف
پھر یہ دل شیفتۂ چاہ زنخداں ہوگا

پھر لکھوں گا تری رفتار کی خط میں تعریف
نامہ بر پھر مرا کبک خراماں ہوگا

گھر میں پھر دل مرا گھبرانے لگا آپ سے آپ
اے جنوں پھر یہ مکاں خانۂ زنداں ہوگا

پھر ہوا عشق ترے ناوک مژگاں سے مجھے
پھر عوض دل کے مرے سینہ نیستاں ہوگا

یاد پھر یار کی تڑپائے گی بجلی کی طرح
ابر پھر ساتھ مرے رونے کو گریاں ہوگا

پھر مرے نالوں سے ہو جائے گا محشر برپا
چاک پھر صبح قیامت کا گریباں ہوگا

پھر خوش آتی ہے مرے دل کو شب ماہ کی سیر
عشق پھر چاند سے مکھڑے کا دو چنداں ہوگا

پھر ہوا جوش جنوں جاؤں گا پھر صحرا کو
پھر ہر اک آبلے میں خار مغیلاں ہوگا

مجھ سے پھر میرے یہ خوش چشم کریں گے کاوش
سبزہ پھر قبر کا پامال غزالاں ہوگا

پھر طبیعت مری آنے لگی اک کافر پر
پھر نہ دل ہوگا نہ دیں ہوگا نہ ایماں ہوگا

پھر مزہ عشق کا چکھیں گے مرے زخم جگر
ہاتھ میں پھر مرے قاتل کے نمکداں ہوگا

ان دنوں پھر تجھے گویا ہے جو چپکی سی لگی
پھر ارادہ طرف ملک خموشاں ہوگا

(۱۷) مومن ۱۸۵۲ء

حکیم مومن خاں ولد حکیم غلام نبی خاں دہلوی خاندانی شریف اور طبیب تھے ان کے اسلاف کشمیر سے دہلی آئے تھے اور شاہ عالم کے عہد میں موضع بلابہ پرگنہ نور نول (پنجاب) میں اُنھیں جاگیر عطا ہوئی تھی ۱۲۲۳ھ میں پیدا ہوئے شاہ نصیر کے شاگرد تھے مگر تھوڑے دنوں بعد اُنھیں اپنا کلام دکھانا چھوڑ دیا اور ایسی مشق سخن بڑھائی کہ خود استاد ہوگئے وارفتہ طبیعت عاشق مزاج آدمی تھے۔ نازک طبع عالی خیال تھے غزل کے علاوہ قصائد میں بھی ان کا خاص رنگ تھا اور مثنویاں میں تو وہ رنگ اختیار کیا ہے جو بے مثل ہے ان کا تخیل اعلیٰ درجہ کا ہے غالب کے کلام کی طرح ان کا کلام بھی ایک بار سمجھ میں نہیں آتا جب پڑھئے نہایت لطف آتا ہے ۱۲۶۸ھ مطابق ۱۸۵۲ء کو کوٹھے سے گر کر ۵۲ سال کی عمر میں جوان فوت ہوئے مہندیوں کے قبرستان میں دہلی کے مرحوم محدثین کے حریم کے باہر مشرقی دیوار کے زیر سایہ دفن ہیں۔ دیوان موجود ہے۔

(۵۲) قطعہ

وہ نوجوان عابد و زاہد کہ جس سے
کہتے تھے مومن اور بہت دیندار تھا

کل ایسے حال سے نظر آیا کہ کیا کہوں
جو تھا سو اس کو دیکھ کے زار و نزار تھا

عبرت کی جا ہے ان صنموں نے کیا خراب
ملنے سے جن کے مستعد ننگ و عار تھا

بیمار کردہ بادۂ حسرت ہے آہ
کیا ہو گئے وہ روز کہ پرہیزگار تھا

یاد آ نہیں ڈراتے تجھے خود شیخ شہر
اپنے مرید داغ جنوں شعلہ بار تھا

اختر تمہاری شبِ غم نے بھلا دیا
جتنا خیال پرسشِ روزِ شمار تھا

ہر ایک کی طرف نگہ بے کسانہ تھی
کس کی نگاہِ لطف کا امیدوار تھا

ہمت سے اور ناز اٹھانے کی آرزو
باقی تھی گو کہ ضعف ہے جینا بھی بار تھا

ہر دم ہوائے آہ سے اڑتی تھی منہ پہ خاک
جتنی کہ سر میں گرد تھی دل میں غبار تھا

زخموں میں بس کہ مشک بھرا تھا میں کیا کہوں
عالم بدن کا اُن کے عجیب لالہ زار تھا

غزل (۵۳)

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی یعنی وعدہ نباہ کا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ جو لطف مجھ پہ تھا پیشتر وہ کرم کہ تھا مرے حال پر
مجھے یاد ہے وہ ذرا ذرا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ نئے گلے وہ شکایتیں وہ مزے مزے کی حکایتیں
وہ ہر ایک بات پہ روٹھنا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

ہوئے اتفاق سے گر بہم تو وفا جتانے کو دم بدم
گلۂ ملامت اقربا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کوئی ایسی بات اگر ہوئی کہ تمھارے جی کو بری لگی
تو بیان سے پہلے ہی بھولنا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کبھی ہم میں تم میں بھی راہ تھی کبھی ہم میں تم میں بھی چاہ تھی
کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

سنو! ذکر ہے کئی سال کا کہ کیا اک آپ نے وعدہ تھا
سو نباہنے کا تو ذکر کیا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کہا بات میں نے وہ کوٹھے کی ترے دل سے صاف اتر گئی
تو کہا کہ جانے مری بلا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ بگڑنا وصل کی رات کا وہ نہ ماننا کسی بات کا
وہ نہیں نہیں کی ہر آن ادا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

جسے آپ گنتے تھے باخدا۔ جسے آپ کہتے تھے باوفا
میں وہی ہوں مومن مبتلا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

(۵۴)

دفن جب گور میں ہم سوختہ ساماں ہوں گے
فلس ماہی کے گل شمع شبستاں ہوں گے

ناوک انداز جدھر دیدۂ جاناں ہوں گے
نیم بسمل کئی ہوں گے کئی بے جاں ہوں گے

تاب نظارہ نہیں آئینہ کیا دیکھنے دوں
اور بن جائیں گے تصویر جو حیراں ہوں گے

تو کہاں جائے گی کچھ اپنا ٹھکانا کر لے
ہم تو کل خواب عدم میں شب ہجراں ہوں گے

ناصحا دل میں تو اتنا تو سمجھ اپنے کہ ہم
لاکھ ناداں ہوئے کیا تجھ سے بھی ناداں ہوں گے

کر کے زخمی مجھے نادم ہوں یہ ممکن ہی نہیں
گر وہ ہوں گے بھی تو بے وقت پشیماں ہوں گے

ایک ہم ہیں کہ ہوئے ایسے پشیماں کہ بس | ایک وہ ہیں کہ جنھیں چاہ کے ارماں ہوں گے

ہم نکالیں گے سن اے موج ہوا بل تیرا | اُس کی زلفوں کے اگر بال پریشاں ہوں گے

صبر یارب مری وحشت کا پڑے گا کہ نہیں | چارہ فرما بھی کبھی قیدیٔ زنداں ہوں گے

منتِ حضرتِ عیسیٰ نہ اُٹھائیں گے کبھی | زندگی کے لیے شرمندۂ احساں ہوں گے

تیرے دل تفتہ کی تربت پہ عدو جھوٹا ہے | گُل نہ ہوں گے شررِ آتشِ سوزاں ہوں گے

غور سے دیکھتے ہیں طوف کو آہوئے حرم | کیا کہیں اس سگِ کوچہ کے قرباں ہوں گے

داغِ دِل نکلیں گے تربت سے مری جوں لالہ | یہ وہ اخگر نہیں جو خاک میں پنہاں ہوں گے

چاک پردہ سے یہ غمزے ہیں تو اے پردہ نشیں | ایک میں کیا کہ سبھی چاک گریباں ہوں گے

پھر بہار آئی وہی دشت نوردی ہوگی | پھر وہی پاؤں وہی خارِ مغیلاں ہوں گے

سنگ اور ہاتھ وہی وہ ہی سر و داغِ جنوں | وہی ہم ہوں گے وہی دشت و بیاباں ہوں گے

عمر ساری تو کٹی عشقِ بتاں میں مومنؔ
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

(۱۸) تسکین ۱۸۵۱ء

میر حسین ولد میر حسن عرف میرن صاحب ان کا سلسلۂ نسب میر ضیاء نعمان تک پہنچتا ہے جو حسین علی خاں وزیر فرخ سیر کا قاتل تھا حضرت تسکین ۱۲۱۸ھ میں دہلی پیدا ہوئے فارسی مولوی امام بخش صاحب صہبائی دہلوی سے پڑھی ابتدا میں شاہ نصیر دہلوی کو اپنا کلام

دکھاتے رہے پھر حکیم مومن خاں صاحب مومن دہلوی کے زمرۂ تلامذہ میں داخل ہو گئے معاش کی تلاش میں کچھ دنوں تک لکھنؤ میرٹھ وغیرہ قیام رہا پھر رام پور میں ملازم ہو گئے اور ۱۲۶۶ھ میں وہیں انتقال کیا پچاس سال کی عمر پائی انھوں نے شاہ نصیر مرحوم کا دیوان ترتیب دے کر اردو کی ادبی دنیا پر بڑا احسان کیا ہے ترکیب بندش اور میدان تخیل میں اپنے استاد کے نقش قدم پر چلتے تھے ان کا دیوان نایاب ہے نمونہ کلام یہ ہے:

غزل (۵۵)

کس سے دفن نہ اُس کوچہ میں احباب مجھے	خاک میں دل ہی کی کدورت نے دیا داب مجھے
ہجر میں پاس نہ ہے زہر نہ خنجر افسوس!	نہ دیئے موت کے بھی چرخ نے اسباب مجھے
قاصد آیا ہے وہاں سے تو ذرا تھم تو سہی	بات تو کرنے دے اُس سے دل بیتاب مجھے

نام تسلیمؔ پہ یہ مضمون بندش تازہ ہوا
تھا تخلص جو ہنر اور تو بیتاب مجھے

(۱۹) وزیر ۱۸۵۴ء

خواجہ محمد وزیر لکھنوی خلف خواجہ محمد فقیر۔ آپ خواجہ بہاء الدین نقشبندی کی اولاد میں تھے حضرت ناسخ کے تلامذہ میں مامور تھے کلام میں حسن و عشق کے ساتھ اخلاق اور تصوف کی چاشنی موجود ہے سب سے پہلے آپ کا دیوان ۱۲۷۲ھ میں مطبع مصطفائی لکھنؤ نے چھاپا تھا اس کے بعد دوسری جگہ طبع ہوا عام طور پر بازاروں میں ملتا ہے ذیقعدہ ۱۲۷۰ھ
۱۸۵۴ء

میں وفات پائی۔ خواجہ صاحب کی یہ غزل زبان زد خلائق ہے۔

غزل (۵۶)

چلا ہے او دلِ راحت طلب کیا شادماں ہو کر
زمینِ کوئے جاناں رنج دیگی آسماں ہو کر

ہمیں باعث تھے قتلِ عاشقاں کو منع کرتے تھے
اکیلے پھر رہے ہو یوسفِ بے کارواں ہو کر

کیا غیروں کو قتل اُس نے موئے ہم رشک کے مارے
اجل بھی دوستو آئی نصیبِ دشمناں ہو کر

بناوٹ نے بگاڑا باتیں سنوا ہیں خموشی نے
نہ پوچھو ہم نے کیا ہی منہ کی کھائی بے زباں ہو کر

وہ پیاسا ہوں لگی گر تیغ پر آب سے جیب کھینچی
نکل آئی دہانِ زخم سے سوکھی زباں ہو کر

ادا سے چھل کے ملتے ہو نگہ سے قتل کرتے ہو
ستم ایجاد ہو ناوک لگاتے ہو کماں ہو کر

جبینِ نامہ کیا لایا تنِ بیجاں میں جاں آئی
گیا یاں سے کبوتر واں سے آیا مرغِ جاں ہو کر

کہیں گر تزنہ در رگور زیرِ پائے تو زیبا ہی
کیا ہی میں نے پیدا اشک حرف سخت جاں ہو کر

(۲۰) ذوق ۱۸۵۵ء

شیخ محمد ابراہیم ولد شیخ محمد رمضان دہلوی ۱۱ ذی الحجہ سنہ ۱۲۰۴ھ (۱۷۸۹ء) کو پیدا ہوئے شاہ نصیر کے شاگرد تھے۔ اکبر شاہ ثانی بادشاہ دہلی نے ۱۹ سال کی عمر میں خاقانی ہند کا خطاب دیکر اپنے دربار کا ملک الشعرا بنا دیا۔ ابو ظفر بادشاہ ولیعہدی کے زمانے میں ہی اُن کے شاگرد ہو گئے تھے کلام میں عاشقانہ معاملہ بندی اور رندانہ مضامین کی شوخی کی بہ نسبت متانت زیادہ ہے

زبان کی صفائی محاورہ بندی اور بندشوں کی چستی کا ان کو خاص خیال ہے غزلوں میں مختلف مواقع پر ضرب الامثال کو نظم کرنا انھیں کا حصہ ہے ان کے قصائد خاص طور پر ممتاز ہیں ۲۴ صفر سنہ ۱۲۷۱ھ (۱۸۸۵ء) کو انتقال کیا پروفیسر آزاد نے لکھا ہے کہ مرنے سے تین گھنٹے قبل یہ شعر تصنیف کیا تھا۔

کہتے ہیں ذوق آج جہاں سے گزر گیا
کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

ان کا ایک مختصر دیوان اردو جسے حافظ غلام رسول ویران نے سنہ ۱۲۷۹ھ میں ترتیب دیا تھا عام طور پر رائج ہے سنہ ۱۸۹۰ء سے کچھ قبل دیوان کو بہت سی غزلوں اور مضامین کے اضافہ کے ساتھ پروفیسر آزاد نے ترتیب دیا جو لاہور سے شائع ہوا ہے۔ نمونہ کلام یہ ہے:-

غزل (۵۷)

کسی بیکس کو اے بیداد گر مارا تو کیا مارا
جو آپ ہی مر رہا ہو اُس کو گر مارا تو کیا مارا

نہ مارا آپ کو جو خاک ہو اکسیر بن جاتا
اگر پارے کو اے اکسیر گر مارا تو کیا مارا

بڑے موذی کو مارا نفس امارہ کو گر مارا
نہنگ و اژدہا و شیر نر مارا تو کیا مارا

خطا تو دل کی تھی قابل بہت سی مار کھانے کی
تری زلفوں نے مشکیں باندھ کر مارا تو کیا مارا

نہیں وہ قول کا سچا ہمیشہ قول دے دے کر
جو اُس نے ہاتھ میرے ہاتھ پر مارا تو کیا مارا

تفنگ و تیر تو ظاہر نہ تھا کچھ پاس قاتل کے
الٰہی پھر جو دل پر تاک کر مارا تو کیا مارا

ہنسی کے ساتھ یاں رونا ہے مثل قلقل مینا
کسی نے قہقہہ اے بے خبر مارا تو کیا مارا

مرے آنسو ہمیشہ ہیں برنگِ لعل غرقِ خوں
جو غوطہ آب میں تو نے گہر مارا تو کیا مارا

جگر دل دو تو پہلو میں ہیں زخمی اس نے کیا جانے
اِدھر مارا تو کیا مارا اُدھر مارا تو کیا مارا

گیا شیطان مارا ایک سجدہ کے نہ کرنے میں
اگر لاکھوں برس سجدے میں سر مارا تو کیا مارا

دلِ بدخواہ میں تھا مارنا یا چشمِ بد بیں میں
فلک پر ذوق تیرِ آہ گر مارا تو کیا مارا

(۵۸)

آنکھیں مری تلووں سے وہ مل جائے تو اچھا
ہے حسرتِ پابوس نکل جائے تو اچھا

جو چشم کہ بے نم ہو وہ ہو کور تو بہتر
جو دل کہ ہو بے داغ وہ جل جائے تو اچھا

بیمارِ محبت نے لیا تیرے سنبھالا
لیکن وہ سنبھالے سے سنبھل جائے تو اچھا

ہو تجھ سے عیادت جو نہ بیمار کی اپنے
لینے کو خبر اُس کی اجل جائے تو اچھا

کھینچے دلِ انساں کو نہ وہ زُلفِ سیہ فام
اژدر کوئی انساں کو نگل جائے تو اچھا

اے گریہ نہ رکھ میرے تنِ خشک کو غرقاب
لکڑی کی طرح پانی میں گل جائے تو اچھا

تاثیرِ محبت تو عجب حُب کا عمل ہے
لیکن یہ عمل یار پہ چل جائے تو اچھا

فرقت سے تری تارِ نفس سینے میں میرے
کانٹا سا کھٹکتا ہے نکل جائے تو اچھا

ہاں کچھ تو ہو حاصل ثمرِ نخلِ محبت
یہ سینہ پھپھولوں سے جو پھل جائے تو اچھا

دل گر کے نظر سے تری اُٹھنے کا نہیں پھر
یہ گرنے سے پہلے ہی سنبھل جائے تو اچھا

ق

وہ صبح کو آئے تو کروں باتوں میں دوپہر
اور چاہوں کہ دن تھوڑا سا ڈھل جائے تو اچھا

ڈھل جائے جو دن بھی تو اسی طرح کروں شام
جب کل ہو تو پھر وہ ہی کہوں کل کی طرح سے
القصہ نہیں چاہتا ہیں جائے وہ یاں سے

او پھر کہوں گر آج سے کل جائے تو اچھا
گر آج کا دن بھی یونہی ٹل جائے تو اچھا
دل میری ہی باتوں میں بہل جائے تو اچھا

ہے قطع رہِ عشق میں اے ذوق ادب شرط
جوں شمع تو اب سر ہی کے بل جائے تو اچھا

(۵۹)

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
ہم سا بھی اس بساط پہ کم ہوگا بدقمار
بہتر تو ہے یہی کہ نہ دنیا سے دل لگے
ہو عمرِ خضر بھی تو ہو معلوم وقتِ مرگ

اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے
جو چال ہم چلے وہ بہت ہی بری چلے
پر کیا کریں جو کام نہ بے دل لگی چلے
ہم کیا رہے یہاں ابھی آئے ابھی چلے

(۶۰)

کیا غرض لاکھ خدائی میں ہوں دولت والے
چاہیں گر چارہ جراحت کا محبت والے
گئے جنت میں اگر سوزِ محبت والے
ساقیا ہوں جو صبوحی کی نہ عادت والے
ہے جوں جنبشِ ساعت کہ ملا رہ دونول
کس مرض کی ہیں دوا لیت و لعل بخشش ترے

ان کا بندہ ہوں جو بندے ہیں محبت والے
بیچیں الماس نمک سنگِ جراحت والے
تو یہ جانو رہے دوزخ ہی میں جنت والے
صبحِ محشر کو بھی اٹھیں نہ ترے متوالے
کبھی مل بھی گئے دو دل جو کدورت والے
جاں بلب ہیں ترے آزارِ محبت والے

حرص کے پھیلتے ہیں پانوں بقدرِ وسعت
تنگ ہی رہتے ہیں دُنیا میں فراغت والے

ہائے لے حسرتِ دیدار مری "ھائے" کو بھی
لکھتے ہیں ہائے دو چشمی سے کتابت والے

نہیں جز شمع مجاور مری بالینِ مزار
نہیں جز کثرتِ پروانہ زیارت والے

نہ ستم کا کبھی شکوہ نہ کرم کی خواہش
دیکھو تو ہم بھی ہیں کیا صبر و قناعت والے

کیا تماشا ہے کہ مثلِ مہ نو اپنا فروغ
جانتے اپنی حقارت کو ہیں شہرت والے

دل سے کچھ کہتا ہوں میں مجھ سے ہے دل کچھ کہتا
دونوں اک حال میں ہیں رنج و مصیبت والے

تو جو آجائے تو اے دردِ محبت کی دوا
تیرے بیمار ہوں بیدار و بصیرت والے

چھوڑ دیتے ہیں قلم جوں قلمِ آتش باز
میری شرحِ تپشِ دل کی کتابت والے

کبھی افسوس ہے آتا کبھی رونا آتا
دلِ بیمار کے دو ہی ہیں عیادت والے

تو مرے حال سے واقف ہے پہ اے غفلت کیش
تیرے اندازِ تغافل نہیں غفلت والے

ناز ہے گل کو نزاکت پہ چمن میں اے ذوق
اُس نے دیکھے ہی نہیں ناز و نزاکت والے

(۲۱) صبا ۱۸۵۵ء

میر وزیر علی ولد میر بندہ علی لکھنوی خواجہ آتش کے ممتاز شاگردوں میں تھے عاشقانہ رنگ میں زیادہ شعر لکھتے تھے آپ کا دیوان چھپ چکا ہے۔ ان کو حضرت واجد علی شاہ کے یہاں سے ۲۰۰ دو سو روپیہ ماہوار ملا کرتے تھے ۱۲۷۲ھ میں گھوڑے سے گر کر انتقال کیا۔ نمونہ کلام یہ ہے:-
۱۸۵۵ء

غزل (۶۱)

اے صبا جذبہ جس دم دلِ ناشاد آیا
میرے آغوش میں اُڑ کر وہ پری زاد آیا

دل میں اک درد اُٹھا آنکھوں میں آنسو بھر آئے
بیٹھے بیٹھے ہمیں کیا جانیئے کیا یاد آیا

بن گیا خالِ جبیں کوکبِ بخت خورشید
کس ترقی پہ ترا حُسن خداداد آیا

(۶۲)

شور جس کا ہی وہ ہی عشق جنوں زا دل میں
بڑھ گیا ہی نمکیں حُسن کا سودا دل میں

بات بھی آپ کے آگے نہ زباں سے نکلی
لیجئے آئے تھے ہم سوچ کے کیا کیا دل میں

عرصۂ حشر میں ہوگا گذری کا عالم
لے نہ جانا کہیں دُنیا کا بکھیڑا دل میں

چھا گیا لیجئے بڑھ کر یہ چمنِ ہستی پر
نخل اُلفت کا لگایا تھا ذرا سا دل میں

اے صبا جس کے لئے ہوں میں پریشاں خاطر
جانتا ہی وہ مجھے گیسوؤں والا دل میں

(۶۳)

مغتنم ہی باغِ عالم کی ہوا دو چار دن
صورتِ گل ہی یہاں نشو و نما دو چار دن

سبزۂ خط کا نمو ہی چاند سے رُخسار پر
ورنہ پھر چھوڑ تو زلفِ دوتا دو چار دن

اُڈ بتا کافر تری اللہ رے بے پروائیاں
آشنا دو چار دن نا آشنا دو چار دن

مدعائے وصل سُن کر وہ صنم کہنے لگا
بیٹھ کر مسجد میں کر یادِ خدا دو چار دن

مجھ گریباں چاک کے مرنے سے اک خلقت رہی
دار ہی اُس شوخ کے بندِ قبا دو چار دن

روز آتی ہی لبِ گورِ غریباں سے صدا
شادی و غم ہی پئے شاہ و گدا دو چار دن

نکہتِ گل پھر کہاں بادِ بہاری پھر کہاں دام پیدا کیجئے ہو چکی مفلس ہوئے	باندھ لے ای باغباں اپنی ہوا دو چار دن بیٹھے مسجد میں بن کر پارسا دو چار دن

بادۂ گلگوں چلے ہر روز چل کر باغ میں
موسمِ گل کے یہی ہیں اے صبا دو چار دن

(۲۲) تنہا ۱۸۵۷ء

نواب سید محمد خاں فرزند نواب سراج الدولہ غیاث الدین محمد خاں بہادر نصرت جنگ نیشاپوری اُن کے والد پہلے فیض آباد میں رہتے تھے پھر لکھنؤ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ ۱۰ ربیع الاول ۱۲۱۲ھ مطابق ۱۷۹۷ء کو فیض آباد میں پیدا ہوئے جب تک وہاں رہے اپنا کلام میر مستحسن خلیق والد میر انیس کو دکھایا۔ لکھنؤ میں آکر آتش کے شاگرد ہو گئے اردو شاعری میں قفس چھپانہ۔ آب و دانہ گرفتاری وغیرہ کے مضامین ان کا حصہ ہے ۱۸۵۷ء میں زندہ تھے غدر سے کچھ دنوں قبل انتقال کیا۔ دیوان ہر جگہ ملتا ہے۔ یہ غزل زبان زد خاص و عام ہے۔

(۴۷) غزل

کھلی ہے کنجِ قفس میں مری زباں صیاد اُجاڑا موسمِ گل ہی میں آشیاں میرا اُداس دیکھ کے مجھ کو چمن دکھاتا ہے دکھایا کنجِ قفس مجھ کو آب و دانے نے	میں ماجرائے چمن کیا کروں بیاں صیاد الٰہی ٹوٹ پڑے تجھ پہ آسماں صیاد کئی برس میں ہوا ہے مزاجداں صیاد وگرنہ دام کہاں میں کہاں کہاں صیاد

پھولوں کو کھول سے نالہ جو بند کرتا ہی
الٰہی دیکھئے کیونکر نباہ ہوتا ہی
رہے نہ قابل پرواز بال و پر میرے
قفس پہ رکھنے لگا اب تو ہار پھولوں کے

قفس کو لے کے میں اُڑ جاؤں گا کہاں صیاد
زباں دراز ہوں میں اور یہ زباں صیاد
قفس سے اُڑ کے میں اب جاؤنگا کہاں صیاد
ہزار شکر ہوا مجھ پہ مہرباں صیاد

فریب دانہ نہ کھاتا میں زینہار ای زیلہ
نہ کرتا دام اگر خاک میں نہاں صیاد

(۶۵)

خود پر آنکھ نہ ڈالے کبھی شیدا تیرا
شان ارفع ہی تری مرتبہ اعلیٰ تیرا
ایک عالم کو ترے نام کا ہی ورد و وست
دیدہ لیلےٰ کے لیے دیدہ مجنوں ہی ضرور
جستجو میں نہ دوڑیں تری ٹوٹیں وہ پاؤں
تو ہی کس نے اس کو بنایا ہی یہ قدرت ہیے

سب سے بے گانہ ہے ای دوست تماشا تیرا
تو ہی یکتا ہی کوئی ثانی نہیں حقا تیرا
میں ہی کچھ ذکر نہیں کرتا ہوں تنہا تیرا
میری آنکھوں سے کوئی دیکھے تماشا تیرا
سر وہ کٹ جائے نہ ہو جس میں کہ سودا تیرا
تو ہی چاہے گا تو بگڑے گا یہ پتلا تیرا

عاشق روئے پری شیفتہ حور نہیں
جان جاں کہتا ہی دیوانہ وشیدا تیرا

(۲۳) اختر ۱۸۵۸ء

ملک الشعرا قاضی محمد صادق خاں ولد قاضی محمد لعل ہگلی (ملک بنگال) کے قاضی زادوں میں تھے مگر علم پرستی اور ذوقِ سخن نے ان کو وطن چھڑا کر لکھنؤ رہنے پر مجبور کیا میرزا قتیل عقیل کے شاگرد تھے۔ فارسی۔ اُردو۔ دونوں زبانوں میں شعر لکھتے تھے آپ نے ایک تذکرہ آفتاب عالم تاب کے نام سے مرتب کیا تھا جس میں پانچ ہزار شعراء کا حال اور انتخاب درج تھا۔ غازی الدین حیدر والیٔ لکھنؤ نے ان کو ملک الشعراء کا خطاب دیا تھا ۱۲۷۵ھ ۱۸۵۸ء میں وفات پائی۔ صبح صادق نور الانشا محامد۔ جیدریہ دیوان فارسی۔ دیوان ریختہ۔ آپ کی یادگار ہیں۔ آپ کا مصنفہ تذکرہ آفتاب عالمتاب نایاب ہے آپ کا یہ قطعہ نہایت مشہور ہے۔

۷۶ قطعہ

کل بن کے شیخ مجتہدِ عصر سا قیا
کہنے لگا نہ راہِ تبختر مجھے یہ طنز
ہم نے کہا کہ یہ تو ہیں ہم خوب جانتے
گستاخی ہو معاف تو اک عرض میں کروں
تقوے ہمارے آگے ہو جب آپ کا درست
مے ہو مے رنگیں بلغ ہو ساقی ہو ماہوش
گردن میں ہاتھ ڈال کے وہ شوخ بے حجاب

دکھلا کے باغ سبز عذاب و ثواب کا
معلوم ہو گا حشر کو پینا شراب کا
پر کیا کریں کہ ہے ابھی عالم شباب کا
کیجے جو آپ مجھ کو نہ موردِ عتاب کا
اور ہو یقین آپ کے اس اجتناب کا
اور وہاں کوئی مخل نہ ہو باعث حجاب کا
دے ذائقہ زباں کو دہن کے لعاب کا

کھینچے ہنسی سے اپنا ملا کر وہ منہ سے منہ
منت سے یوں کہے کہ ہمارا لہو پیجئے
اُس وقت ہم سلام کریں قبلہ آپ کو

یہ ریش جس پہ جلوہ ہے رنگِ خضاب کا
گر پی نہ جائے جل بہ ساغر شراب کا
گر کچھ بھی خوف کیجئے روزِ حساب کا

اور امتحاں بغیر تو یہ آپ کا غلام
قائل نہیں ہے قبلہ کسی شیخ و شاب کا

(۴۷)

عجب ہے کہ یہ تعمیر خراب آباد ہستی ہے
تردد کیوں نہیں اے ساکنانِ ملک ہستی ہے
ہر اک دل میں سوائے پیروی ہے نفس کافر کی
حصولِ جاہ کی تدبیر جو ہم لوگ کرتے ہیں
گلوں کا ہے گریباں چاک سنتے جو سحر سے

کہ پستی یاں بلندی ہے بلندی یاں کی پستی ہے
علام کی راہ سیدھی ہے بلندی ہے نہ پستی ہے
خدا کے گھر میں ہے دیکھئے کیا بت پرستی ہے
ہماری سعی باطل دیکھ کر تقدیر ہنستی ہے
صبا مضطرب ہے اور گھٹا غنچوں کی کستی ہے

سمجھ ہر ایک کو ہشیار ہم آئے تھے یاں اختر
بچشم غور جو دیکھا تو متوالوں کی بستی ہے

(۲۴) امانت ۱۸۵۹ء

سید آغا حسن خلف میر آغا حسین رضوی لکھنوی۔ آپ سید علی رضوی کی اولاد سے تھے
سنہ ۱۲۳۱ھ میں حضرت امانت کی ولادت ہوئی فن شعر میں لکھنؤ کے مشہور مرثیہ گو سے استفادہ

حاصل کیا۔ ابتدا میں مرثیے اور ریختیاں کہنے کا شوق ہوا مگر اس فن میں پورے پورے نہ اترے تو دیگر اصناف سخن کی طرف توجہ فرمائی۔ رعایت لفظی اور ضلع جگت کے عاشق تھے لکھنؤ کی قدیم سوسائٹی ضلع و رعایت کو شاعری کا اصلی جوہر سمجھتی تھی اس میں آپ نے کمال حاصل کر لیا تھا۔ یوں تو آپ صاحب دیوان ہیں جملہ اصناف سخن پر قادر ہیں مرثیہ گوئی میں بھی اپنی طباعی دکھائی ہے لیکن ان کی اندر سبھا کو اردو ڈرامہ میں جو شہرت حاصل ہوئی ہے وہ اپنی نظیر آپ ہے۔ یہ کہنا ذرا بھی بیجا نہیں کہ آپ نے اردو زبان میں اس کتاب کو لکھ کر سب سے پہلے ڈرامے کی بنیاد ڈالی ہے اردو متقدمین میں اس نمونہ کی ایک نظم بھی نہیں ملتی حضرت امانت نے ۸ جمادی الاولےٰ ۱۲۷۵ھ کو وفات پائی۔ دیوان طبع ہو چکا ہے۔ نمونہ کلام حسب ذیل ہے:۔

غزل (۶۸)

بھولا ہوں میں عالم کو سرشار اسے کہتے ہیں
مستی میں نہیں غافل ہشیار اسے کہتے ہیں

گل گھر سے جو وہ نکلا اک شور ہوا برپا
دل بس گئے عالم کے رفتار اسے کہتے ہیں

تصویر کو سکتہ ہے کہتے ہیں اسے نقشہ
آئینے کو حیرت ہے رخسار اسے کہتے ہیں

اک رشتۂ الفت میں گردن ہے ہزاروں کی
تسبیح اسے کہتے ہیں زنّار اسے کہتے ہیں

دل میں شب فرقت میں کیا ساتھ دیا میرا
مونس اسے کہتے ہیں غمخوار اسے کہتے ہیں

اک قطرہ نہیں مے کا میخانہ میں اے ساقی
خم کر دیئے سب خالی میخوار اسے کہتے ہیں

دل ہجر کی شب غش ہے بیدار رہی چشم اپنی
بے ہوشی اسے کہتے ہیں ہشیار اسے کہتے ہیں

خاموش امانت ہی کچھ اُف بھی نہیں کرتا
کیا کیا نہیں اے پیارے اغیار سے کہتے ہیں

(۲۵) نسیم ۱۸۶۰ء

منشی دیا شنکر لکھنوی ولد گنگا پرشاد پنڈت کشمیری آپ خواجہ آتش مرحوم کے شاگردوں میں تھے مثنوی گلزار نسیم آپ کی مشہور تصنیف ہے جو ۱۸۳۳ء میں نظم کی گئی تھی گو اس کا پلاٹ نثر کے ایک پرانے قصے سے لیا گیا ہے مگر انداز بیان نہایت دلکش ہے چھوٹی بحر اور مختصر الفاظ میں اہم مضامین ادا کئے گئے ہیں حال میں مثنوی گلزار نسیم و میر حسن کے متعلق بابو برج نرائن چکبست او مولوی عبد الحلیم شرر کے درمیان مباحثہ ہوا تھا اس مباحثہ میں دونوں مثنویوں پر فن تنقید کے جوہر دکھائے گئے ہیں اس مثنوی کے علاوہ نسیم کا ایک دیوان بھی تھا ہے مثنوی کا انتخاب یہ ہے :-

(۶۹) آوارہ ہونا بکاؤلی کا تلاش گُل میں

گُل کا جو الم چمن چمن ہے — یوں بلبلِ خامہ نعرہ زن ہے
گلچیں نے وہ پھول جب اڑایا — اور غنچۂ صبح کھل کھلایا
وہ سبزۂ باغ خواب آرام — یعنی وہ بکاؤلی گل اندام
جاگی مژۂ سحر کے غل سے — اٹھی نکہت سی فرشِ گل سے
منہ دھونے جو آنکھ ملتی آئی — پُر آب وہ چشمِ حوض پائی

دیکھا تو وہ گُل ہُوا ہوا ہے
گھبرائی کہ ہیں؟ کدھر گیا گُل
ہے ہے مرا پھول لے گیا کون؟
ہاتھ اُس پہ اگر پڑا نہیں ہے
نرگس تو دکھا ۔ کدھر گیا گُل
سنبل مرا تازیانہ لانا
اینٹوں میں سے پھول لے گیا کون
شبنم کے سوا چرانے والا
جس کف میں وہ گُل ہو داغ ہو جائے
گلچیں کا جو ہائے ہاتھ ٹوٹا
او خار پڑا نہ تیرا چنگل
او بادِ صبا ہوا نہ پتلا
بلبل تو چہک اگر خبر ہے

کچھ اور ہی گُل کھلا ہوا ہے
جھنجھلائی کہ کون دے گیا جل
ہے ہے مجھے خار دے گیا کون
بُو ہو گئے تو پھول اڑا نہیں ہے
سوسن تو بتا کدھر گیا گل
شمشاد انھیں سولی پہ چڑھانا
بیگانہ تھا سبزے کے سوا کون
او بیر کا تھا کون آنے والا
جس گھر میں ہو گل چراغ ہو جائے
غنچے کے بھی منہ سے کچھ نہ پھوٹا
سنبلیں کس لیے نہ تو نے سنبل
خوشبو ہی سنگھا بتا نہ بتلا
گُل تو ہی مہک بتا کدھر ہے

(۲۶) ظفر ۱۸۶۲ء

محمد سراج الدین نام خاندان مغلیہ کے آخری بادشاہ تھے ولی عہدی میں ابو ظفر خطاب تھا

بہادر شاہ کے لقب سے اپنے باپ اکبر شاہ ثانی کے جانشین ہوئے۔ تاریخ پیدائش ۲۴ اکتوبر ۱۷۷۵ء مطابق ۲۰ شعبان ۱۱۸۹ھ اور ۲۰ ستمبر ۱۸۳۷ء مطابق ۲۰ جمادی الثانی ۱۲۵۳ھ کو تخت پر بیٹھے۔ زمانہ ولیعہدی سے شعر و سخن کا مذاق رکھتے تھے۔ ابتداء میں شاہ نصیر اور پھر خاقانی ہند ذوق دہلوی کے شاگرد ہوئے۔ علمی قابلیت کے سوا نظری شاعر تھے غدر ۱۸۵۷ء منحوس واقعہ کے زمانہ میں جبکہ بادشاہی حکومت صرف دہلی میں ایک محدود رقبہ کے اندر باقی رہ گئی تھی پیش آیا تھا۔ غدر کے فرو ہونے کے بعد ۱۸۵۸ء میں برٹش گورنمنٹ نے ان کو نظر بند کر کے کلکتہ بھیج دیا تھا وہاں سے رنگون کو منتقل ہو گئے اور اپنی عمر کے بقیہ انفاس وہیں گزارے۔ شاعری کا شغل وہاں بھی جاری رہا سوز و گداز ناکامی و مجروحی کی درد بھری داستانوں کو مختصر الفاظ میں نظم کرنا انھیں کا حصہ تھا۔ ظفر بدنصیب تاجدار کے جسے پرجلیل القدر اسلاف کی مٹی ہوئی یادگار دہلی پر آخری نظر حسرت ڈالکر دہلی سے نکلنا نصیب ہوا ہو جسے گزشتہ اقبال و جاہ و جلال کے خوابوں پر گہری نظر ڈالنے کا موقع ملا ہو دماغ سے اس قسم کے خیالات نکلنے کے سوا دوسرے مضامین کی تلاش کی توقع بھی نہیں کی جا سکتی اُنھوں نے چار دیوان چھوڑے جو مشہور عالم ہیں بمقام رنگون ۷ نومبر ۱۸۶۲ء مطابق ۱۲۷۹ھ کو وفات پائی۔ نمونہ کلام یہ ہے:—

غزل (۷۷)

جہاں ویرانہ ہے پہلے کبھی آباد گھر یاں تھے	شغال اب ہیں وہاں رہتے جہاں بستے بشر یاں تھے
جہاں پھرتے بگولے ہیں اڑاتے خاک صحرا میں	کبھی اڑتی تھی دولت رقص کرتے سیم و زر یاں تھے

جہاں سنسان اب جنگل ہے اور شہر خموشاں ہے
جہاں اب خاک ہے نقش پائے آہوئے صحرا
کبھی کیا کیا نہ ہنگامے تھے یاں اور شور و شر یاں تھے
کبھی محوِ تماشا دیدۂ اہلِ نظر یاں تھے

ظفر احوال عالم کا کبھی کچھ ہے کبھی کچھ ہے
نہ کیا کیا رنگ اب ہیں اور کیا کیا پیشتر یاں تھے

(٧١)

یا مجھے افسرِ شاہانہ بنایا ہوتا
یا مرا تاج گدایانہ بنایا ہوتا
اپنا دیوانہ بنایا مجھے ہوتا تو نے
کیوں خرد مند بنایا، نہ بنایا ہوتا
خاکساری کے لئے گرچہ بنایا تھا مجھے
کاش خاکِ درِ جانانہ بنایا ہوتا
نشۂ عشق کا گر ظرف دیا تھا مجھ کو
عمر کا تنگ نہ پیمانہ بنایا ہوتا
دلِ صد چاک بنایا تو بلا سے لیکن
زلفِ مشکیں کا ترے شانہ بنایا ہوتا
صوفیوں کے جو نہ تھا لائقِ صحبت تو مجھے
قابلِ جلسۂ رندانہ بنایا ہوتا
تھا جلانا ہی اگر دوریِ ساقی سے مجھے
تو چراغِ درِ مے خانہ بنایا ہوتا
شعلۂ حسن چمن میں نہ دکھایا اس نے
ورنہ بلبل کو بھی پروانہ بنایا ہوتا

روز معمورۂ دنیا میں خرابی ہے ظفر
ایسی بستی کو تو ویرانہ بنایا ہوتا

مری آنکھ بند تھی جب تلک وہ نظر میں نورِ جمال تھا
کھلی آنکھ تو نہ خبر رہی کہ وہ خواب تھا کہ خیال تھا

دمِ بسمل اے بُتِ عشوہ گر جو خوشی عید کی سی ہوئی مجھے
خمِ تیغ تیرا جو سامنے نظر آیا مثلِ ہلال تھا

کہو اس تصورِ یار کو کہوں کے خضرِ خجستہ پے
کہ یہی تو دشتِ فراق میں مجھے رہنمائے وصال تھا

مرے دل میں تھا کہ کہوں گا میں جو یہ دل پہ رنج و ملال ہے
وہ جب آگیا مرے سامنے تو نہ رنج تھا نہ ملال تھا

وہ ہے بے وفا وہ ہے پر جفا ہاں لطف کیسا وفا کہاں
فقط اپنا وہم و خیال تھا یہ خیالِ امرِ محال تھا

پس پردہ سُن کے تری صدا اثر اشتیاق و یار جو بڑھ گیا
مجھے اضطرابِ کمال تھا یہی وجہ تھا یہی حال تھا

ظفر اس سے چھوٹ کے جیت کی تو یہ جانا ہم نے کہ واقعی
فقط ایک قیدِ خودی کی تھی نہ قفس تھا کوئی نہ جال تھا

(۷۳)

دیا اپنی خودی کو جو ہم نے اُٹھا وہ جو پردہ بیچ میں تھا نہ رہا
رہے پردے میں اب نہ وہ پردہ نشیں کوئی دوسرا اس کے سوا نہ رہا

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنے خبر رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر
پڑی اپنی بُرائیوں پر جو نظر تو نگاہ میں کوئی بُرا نہ رہا

ترے رخ کے خیال میں کون سے دن اُٹھے مجھ پہ نہ فتنۂ روزِ جزا
تری زلف کے دھیان میں کونسی شب مرے سر پہ ہجوم بلا نہ رہا

ہمیں ساغرِ بادہ کے دینے میں کرے دیر جو ساقی تو ہائے غضب
کہ یہ عہدِ نشاط یہ دورِ طرب نہ رہے گا جہاں میں سدا نہ رہا

کئی روز میں آج وہ مہر لقا ہوا میرے جو سامنے جلوہ نما
مجھے صبر و قرار ذرا نہ رہا اُسے پاسِ حجاب و حیا نہ رہا

ترے خنجر و تیغ کی آبِ رواں ہوئی جبکہ سبیلِ ستم زدگاں
گئے کتنے ہی قافلے خشک زباں کوئی تشنۂ آبِ بقا نہ رہا

مجھے صاف بتائے نگار اگر تو یہ پوچھوں رو رو کے خونِ جگر
ملے پاؤں سے کس کے ہیں دیدۂ تر کفِ پا پہ جو رنگِ حنا نہ رہا

اسے چاہا تھا میں نے کہ روک رکھوں مری جان بھی جائے تو جانے دوں
کئے لاکھ فریب کروڑ فسوں نہ رہا نہ رہا نہ رہا نہ رہا

لگے یوں تو ہزاروں ہی تیرِ ستم کہ تڑپتے رہے پڑے خاک پہ ہم
ولے ناز و کرشمہ کی تیغِ دودم لگی ایسی کہ تسمہ لگا نہ رہا

ظفر آدمی اُس کو نہ جانیے گا وہ ہو کیسا ہی صاحبِ فہم و ذکا
جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

(۲۶) نسیم دہلوی ۱۸۶۲ء

نواب اصغر علی خاں دہلوی خلف نواب آغا علی خاں ۔ آپ مومن دہلوی کے ارشد تلامذہ سے تھے دہلی چھوڑنے کے بعد لکھنؤ سکونت اختیار کر لی تھی۔ عربی فارسی میں کافی استعداد تھی فنِ خوشنویسی میں بھی دستگاہ حاصل تھی۔ آپ کے کلام میں نازک خیالی مضمون آفرینی کے سوا زبان کی خوبیاں اور سادگی کا لطف بھی موجود ہے۔ سنہ ۱۲۷۹ھ مطابق سنہ ۱۸۶۲ء میں وفات پائی الف لیلہ نظم اور دیوان آپ کی یادگار ہے کلام کا انتخاب یہ ہے :-

(۷۵) غزل

عروسِ فکرِ رنگیں کو خیال آیا جو تزئیں کا
شگافِ خامہ شانہ بن گیا زلفِ مضامیں کا

بلا لیتی ہے بخشش سے بہا اے چشمِ تر آنسو
ملے کچھ دامنِ خالی کو صدقہ روحِ غمگیں کا

بہار آئی جھکائے سر گلوں نے کیفِ مستی سے
پڑا ہے گردنِ ہر شاخِ تر پر ہاتھ گلچیں کا

بشکلِ مرغِ بسمل اور بڑھ جاتی ہے بیتابی
دلِ مضطر کو طعنہ ہو گیا ہے دامِ تسکیں کا

دمِ رخصت دی دعا کو مطلبِ بیتاب نے ہیرے
کہ برسوں قافلہ ڈھونڈا کیا فریاد و آمیں کا

نسیم اب رد الی اشتیاقِ سامعیں پر ہے
دکھایا لطف ہم نے ہر طرح سے طبعِ رنگیں کا

(۷۶)

فصلِ گل آئی ہے کل اور ہی ساماں ہونگے
میرے دامن میں ترے دست و گریباں ہونگے

سب یہ کافر ہیں حسینوں کی نہ سُن تو اے دل
شکر ہو جائیں گے انجام کو اپنے شکوے
کھینچے تیغ تامل ہے یہ کیوں بسم اللہ
کس طرح جائیں گے مانع ہے ہمیں خوفِ مزاج
شوخیاں کر لے جنوں آج یہاں پر کل تو
گر یہ انجام تبسم ہے نہ ہنس اے غافل
یاد آئے گا پسِ مرگ ہمارا یہ کمال
تجھ کو کر دیں گے خبر زہر لی سینے کی
خانہ زادوں کو کہاں قیدِ محبت سے فراغ
دم نکل جائے گا گر ہاتھ لگا اے جرّاح

چارہ دن یہی دشمنِ ایماں ہوں گے
رنج کے خوف سے ہم ان کے ثنا خواں ہوں گے
سر جھکا دیں گے جو یاں بندۂ احساں ہوں گے
زُلف پر خم ہے تو کچھ وہ بھی پریشاں ہوں گے
خاک اُڑ جائے گی زمیں دشت یہ ویراں ہوں گے
خون روئیں گے وہی زخم جو خنداں ہوں گے
حال کھل جائے گا جب خاک میں پنہاں ہوں گے
سر پٹکتے ترے در پر مرے ارماں ہوں گے
ہم وہ بلبل ہیں یہیں خلد کی گلستاں ہوں گے
وہ نہیں زخم جو شرمندۂ احساں ہوں گے

وہ ہر نخل کریں گے صفتِ گرد بنیم
ہم پسِ مرگ بھی قربانِ گلستاں ہوں گے

(۲۸) ناظم ۱۸۶۵ء

نواب محمد یوسف علی خاں فردوس مکان خلف نواب محمد سعید خاں بہادر والی رامپور آپ ۲۱ ربیع ۱۲۷۱ھ کو مسند نشین ہوئے نواب صاحب مرحوم علوم عقلیہ کے ماہر منطق فلسفہ سے باخبر تھے طبیعت کو شاعری سے خاص طور پر مناسبت تھی۔ پہلے حکیم مومن خاں دہلوی سے

مشورۂ سخن رکھتے تھے اس کے بعد میرزا غالب کے شاگرد ہو گئے اسی زمانہ میں عاشقانہ دیوان مرتب ہوکر مطبع حسینی رام پور میں طبع ہوا تھا ۲۱ اپریل ۱۸۶۵ء مطابق ۲۴ ذیقعدہ ۱۲۸۲ء کو وفات پائی۔ انتخاب کلام یہ ہے:-

کیا ہوا سرو قدو؟ اب وہ تمھارا خم و چم
کیا ہوا لالہ رخو؟ اب وہ تمھارا عالم
کہو کیوں چھوٹ گئی مشق جفا کاری کی
کہو کیوں ٹوٹ گیا سلسلۂ جور و ستم
کھنچتے کیوں نہیں اب میان سے تم خنجر ناز
دیکھتے کیوں نہیں اب تیغ ادا کا دم خم
کچھ نہ عشاق سے مطلب ہے نہ اغیار سے کام
نہ ادھر چشم غضب ہے نہ ادھر چشم کرم
چین کیوں کر تمھیں آغوش لحد میں آیا
تم تو آغوش تصور میں بھی لیتے نہ تھے دم
کیا گزرتی ہے تہہ خاک تمھارے سر پر
فرش پر تم تو نزاکت سے نہ رکھتے تھے قدم
نازنینو! وہ نزاکت کہو کس نے لے لی؟

سچ بتاؤ تمھیں اپنی ہی نزاکت کی قسم
صحن تک تھا تمھیں دالان سے آنا منزل
کس طرح طے ہوئی راہِ سفرِ ملکِ عدم
ناز و انداز و ادا عشوے کرشمے غمزے
خاک میں مل گئے سب ہائے ستم ہائے ستم
ہائے وہ ابروئے خمدار وہ مژگان دراز
ہائے وہ چشمِ فسوں گر کی ادائیں پیہم
ہائے وہ چینِ جبیں شوخی و انداز کے ساتھ
ہائے وہ ناز سے تیور کا بدلنا ہر دم
ہائے وہ شعلۂ رُخسار کی غصّے میں بھڑک
ہائے وہ گیسوئے پُر پیچ کا ہونا پُر خم
ہائے وہ فتنہ جگانے کی روش سے چلنا
ہائے وہ چھاگلیں پہنے ہوئے پھرنا چھم چھم

وا دریغا نہ رہی ایک بھی صورت باقی
بہرِ عبرت ہی زبانوں پہ حکایت باقی

(۲۹) رشک ۱۸۶۷ء

میر علی اوسط خلف میر سلیمان۔ آپ فیض آباد کے باشندے تھے۔ شاعری میں حضرت ناسخ لکھنوی کے ارشد تلامذہ سے تھے۔ محاورات کی چھان بین الفاظ کی تحقیقات کا شوق تھا۔ پختہ گو اور محقق مشہور رہے۔ تاریخ گوئی میں اچھی مہارت بہم پہونچائی تھی۔ صاحب تصنیف تھے اب دیوان کمیاب ہے۔ ۱۲۸۴ھ مطابق ۱۸۶۷ء میں ۷۰ سال کی عمر پاکر انتقال کیا نمونہ کلام یہ ہے:-

(۶۷) غزل

جو رنج تو سہتے ہیں ہے کیونکر نہ ملے گا — لکھوائیں گے نامہ تو کبوتر نہ ملے گا

جس رات نقاب اس مہ کامل نے الٹ دی — تاروں کو نشانِ مہ انور نہ ملے گا

ابرِ شبِ فرقت ہے بندھا آنسوؤں کا تار — اس طرح کا وقت اے شجرِ تر نہ ملے گا

کاہیدگیٔ جسم اگر یونہی رہے گی — ہم کو بھی ہمارا تنِ لاغر نہ ملے گا

الفت کو سمجھو خضرِ راہ ہدایت — اے رشک اب ایسا کوئی رہبر نہ ملے گا

(۳۰) آزردہ ۱۸۶۸ء

مفتی صدرالدین خاں خلف الرشید مولوی لطف اللہ کشمیری مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے شاگرد رشید تھے اپنے زمانہ کے علماء اور فضلا میں ممتاز تھے ذوق

مومن۔ غالب۔ صہبائی کے ہمعصر اور دوست تھے۔ دہلی میں عہدۂ صدر الصدوری کی خدمات ان کے سپرد تھیں۔ جب مفتی صاحب کے اجلاس میں حضرت غالب مرحوم نے یہ شعر بطور جواب پڑھا کہ ؎

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

اُنھوں نے اس شعر کو سن کر اُن کے قرضہ کا روپیہ اپنی گرہ سے ادا کر دیا۔ آپ نے ایک تذکرہ شعرائے ریختہ بھی ترتیب دیا تھا جو اس زمانہ میں دستیاب نہیں ہوتا مفتی صاحب ایک جید عالم اور عربی زبان کے فاضل تھے۔ مگر نہایت صاف اور پُرلطف شعر لکھتے تھے ۱۲۸۵ھ مطابق ۱۸۶۸ء میں رحلت فرمائی۔ کلام کا انتخاب یہ ہے:-

(۷۸)

یہ کہہ کے رخنہ ڈالیے اُن کے حجاب میں
اچھے بُرے کا حال کھلے کیا نقاب میں

یا رب وہ خواب جس میں مرے خوابِ مرگ ہو
آئے وہ مستِ خواب اگر میرے خواب میں

حال اُس نگہ کا اس کے سراپا میں کیا کہوں
مورِ ضعیف پھنس گئی جا شہدِ ناب میں

یارب یہ کس نے چہرہ سے اُلٹا نقاب ہے
سو رخنے اب نکلنے لگے آفتاب میں

خورشید زار ہو شبِ زمیں دے جھلک ذرا
سو آفتاب ہیں تری گردِ نقاب میں

کیا عقل محتسب کی کہ لایا ہے کھینچ کر
سودا زدوں کو محکمۂ احتساب میں

اُٹھے ہیں صبح کے یہ کہاں سر گرانیاں
زاہد نے مے کا جلوہ یہ دیکھا حباب میں

تحقیق ہو نہ جاتی دل آہ میں کیا نقص کیا
ہر ہر رویں سے کھینچے ہے تیر ہی خوں چکاں
ہیں اور ذوق بادہ کشی ؟ لے گئیں مجھے
امدادِ جہنم کیا ہو لگے دل کو آگ جو
ہیں دونوں مثلِ شیشہ یہ سامانِ صد شکست

لکھا ہے یہ یوں تو سبھی کچھ کتاب میں
غوطے تو سو دیے اُسے زمزم کے آب میں
یہ کم نگاہیاں تری بزم شراب میں
جلنے کے بعد غم نہیں رہتا کباب میں
جیسا ہے میرے دل میں نہیں ہے حباب میں

بے غم اور عشق ہے آزردہ جائے شرم
حضرت یہ باتیں بھی تھیں عہد شباب میں

(۳۱) غالب ۱۸۶۹ء

اسد اللہ خاں عرف میرزا نوشہ المخاطب بہ نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ ۸ رجب ۱۲۱۲ھ مطابق ۱۷۹۶ء کو بمقام آگرہ پیدا ہوئے شادی ہونے کے بعد میرزا صاحب نے دہلی میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی اور ۷۳ برس کی عمر میں ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء مطابق ۱۲۸۵ھ کو انتقال کیا۔ جوارِ حضرت نظام الدین اولیا میں چونسٹھ کھمبا کے قریب ایک حریم میں دفن ہوئے فارسی کی نظم و نثر کے مسلم الثبوت استاد سمجھے جاتے ہیں اُردو انشا پردازی کا طرزِ جدید کے بانی تھے ماہرین سخن کا قول ہے کہ ہندوستان میں شاعری کا آغاز امیر خسرو سے ہوا اور اس کا خاتمہ میرزا غالب پر ہو گیا تاریخ آہنگ، سبد چین، مہر نیم روز وغیرہ آپ کی مشہور تصانیف ہیں علاوہ فارسی کلیات کے دیوان اُردو بھی موجود ہے جو اکثر مطابع کا چھپا ہوا ملتا ہے

۱۹۱۵ء میں ایک خاص ایڈیشن نہایت اہتمام اور جلی قلم عمدہ کاغذ پر مع میرزا کے فوٹو کے نظامی پریس بدایوں سے شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد ۱۹۱۶ء میں اسی پریس نے ایک عمدہ شرح[۱] ایڈیشن نکالا پھر اسی شرح نظامی کے ساتھ کئی پاکٹ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں جس میں علاوہ میرزا کے فوٹو کے اُن کی تحریر کا عکس بھی دیا گیا ہے۔ اس اردو دیوان کی شرح مولانا طباطبائی اور حسرت نے بھی لکھی ہے میرزا کا کلام آج کل کے تعلیم یافتہ گروہ میں نہایت دلچسپی سے پڑھا جاتا ہے۔ وہ اخلاقی اور فلسفی مسائل سے بھرا ہوا ہے اور ان کے تخئیل میں وہ جدت پائی جاتی ہے جو کبھی پرانی ہونے والی نہیں۔ غالب کی طبیعت کو بعض لوگ دشوار پسند کہتے ہیں لیکن جہاں کہیں انھوں نے سلاست کو برتا ہے روانی کے دریا بہا دیئے ہیں۔ اردو زبان پر میرزا کا بڑا احسان ہے کہ نثر میں مراسلے کو مکالمہ بنا کر خطوط نویسی کی ایک جداگانہ طرز نکالی اور نظم میں ایسے اسلوب بیان کا نمونہ چھوڑا کہ ان کے نقش قدم پر چل کر موجودہ زمانے کے تعلیم یافتہ شعرا کو قدرت کے نقش و نگار سیاسی حالات فلسفی مسائل وغیرہ کا نظم کے ذریعہ سے ظاہر کرنا آسان ہو گیا۔ غالب کے حالات اور سوانح میں مولانا حالی کی مبسوط تصنیف یادگار غالب موجود ہے۔ نمونۂ کلام یہ ہے:-

غزل (۷۹)

یہ نہ تھی ہماری قسمت جو وصالِ یار ہوتا	اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا
ترے وعدے پر جیئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا	کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

[۱] شرح مولانا نظامی نے لکھی ہے۔

تری نازکی سے جانا کہ بندھا تھا عہد بودا
کبھی تو نہ توڑ سکتا اگر استوار ہوتا

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غم گسار ہوتا

رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا
جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا

غم اگرچہ جاں گسل ہے یہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غمِ عشق گر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے شبِ غم بری بلا ہے
مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا
جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دو چار ہوتا

یہ مسائلِ تصوف! یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

(۸۰)

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھکو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

ہوا جب غم سے یوں بے حس تو غم کیا سر کے کٹنے کا
نہ ہوتا گر جدا تن سے تو زانو پر دھرا ہوتا

ہوئی مدت کہ غالب مر گیا پر یاد آتا ہے
وہ ہر اک بات پر کہنا کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا

(۸۲)

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ
جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا

عمر بھر دیکھا کیا مرنے کی راہ
مر گئے پر دیکھیے دکھلائیں کیا

پوچھتے ہیں وہ کہ غالبؔ کون ہے؟
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟

(۸۳)

عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

جاتا ہوں داغِ حسرتِ ہستی لیے ہوئے
ہوں شمعِ کشتہ. درخورِ محفل نہیں رہا

مرنے کی اے دل اور ہی تدبیر کر کہ میں
شایانِ دست و بازوئے قاتل نہیں رہا

بر روئے شش جہت. درِ آئینہ باز ہے
یاں امتیازِ ناقص و کامل نہیں رہا

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

دل سے ہوائے کشتِ وفا مٹ گئی کہ واں
حاصل سوائے حسرتِ حاصل نہیں رہا

بیدادِ عشق سے نہیں ڈرتا مگر اسدؔ
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

(۸۴)

لرزتا ہے مرا دل زحمتِ مہرِ درخشاں پر
میں ہوں وہ قطرۂ شبنم کہ ہو خارِ بیاباں پر

نہ چھوڑی حضرتِ یوسف نے یاں بھی خانہ آرائی
سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر

مجھے اب دیکھ کر ابرِ شفق آلودہ یاد آیا
کہ فرقت میں تری آتش برستی تھی گلستاں پر

بجز پروازِ شوقِ ناز کیا باقی رہا ہوگا
قیامت اک ہوائے تند ہے خاکِ شہیداں پر

نہ لڑ ناصح سے غالب کیا ہوا گر اس نے شدت کی
ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر

(۸۵)

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں؟ اب رہو تنہا کوئی دن اور

مٹ جائے گا سر۔ گر ترا پتھر نہ گھسے گا
ہوں در پہ ترے ناصیہ فرسا کوئی دن اور

آئے ہو کل۔ اور آج ہی کہتے ہو کہ "جاؤں"
مانا کہ ہمیشہ نہیں اچھا۔ کوئی دن اور

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے
کیا خوب! قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

ہاں اے فلکِ پیر جواں تھا ابھی عارف
کیا تیرا بگڑتا؟ جو نہ مرتا کوئی دن اور

تم ماہِ شبِ چار دہم تھے مرے گھر کے
پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشہ کوئی دن اور

(۸۶)

ہم سے کھل جاؤ بوقتِ مے پرستی ایک دن
ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذرِ مستی ایک دن

غرۂ اوجِ بنائے عالمِ امکاں نہ ہو
اس بلندی کے نصیبوں میں ہے پستی ایک دن

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیے
بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن

دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

(۸۶)

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہوگئیں

تھیں بنات النعش گردوں دن کو پردے میں نہاں
شب کو ان کے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہوگئیں

قید میں یعقوبؑ نے لی گو نہ یوسفؑ کی خبر
لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہوگئیں

سب رقیبوں سے ہوں ناخوش پر زنانِ مصر سے
ہے زلیخا خوش! کہ محوِ ماہِ کنعاں ہوگئیں

جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہوگئیں

ان پری زادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام
قدرتِ حق سے یہی حوریں اگر واں ہوگئیں

نیند اُس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہوگئیں

ہیں چمن میں کیا گیا۔ گویا دبستاں کھل گیا
بلبلیں سن کر مرے نالے غزل خواں ہو گئیں

وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب دل کے پار
جو مری کوتاہیِ قسمت سے مژگاں ہو گئیں

بس کہ روکا میں نے اور سینے میں ابھریں پے بہ پے
میری آہیں بخیۂ چاکِ گریباں ہو گئیں

واں گیا بھی میں تو ان کی گالیوں کا کیا جواب
یاد تھیں جتنی دعائیں صرفِ درباں ہو گئیں

جاں فزا ہے بادہ جس کے۔ ہاتھ میں جام آگیا
سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگِ جاں ہو گئیں

ہم موحد ہیں۔ ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

یوں ہی گر روتا رہا غالبؔ تو اے اہلِ جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

(٨٧)

دل ہی تو ہے نہ سنگِ خشت۔ درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

دیر نہیں حرم نہیں در نہیں آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہ گزر پہ ہم۔ غیر ہمیں اٹھائے کیوں

جب وہ جمالِ دلفروز صورتِ مہرِ نیم روز
آپ ہی ہو نظارہ سوز۔ پردے میں منہ چھپائے کیوں

دشنۂ غمزہ جاں ستاں۔ ناوکِ ناز بے پناہ
تیرا ہی عکسِ رُخ سہی سامنے تیرے آئے کیوں

قیدِ حیات و بندِ غم۔ اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

حُسن اور اُس پہ حُسنِ ظن۔ رہ گئی بوالہوس کی شرم
اپنے پہ اعتماد ہے۔ غیر کو آزمائے کیوں

واں وہ غرورِ عز و ناز۔ یاں یہ حجابِ پاسِ وضع
راہ میں ہم ملیں کہاں، بزم میں وہ بلائے کیوں

ہاں وہ نہیں خدا پرست جاؤ وہ بے وفا سہی
جس کو ہو دین و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں

غالبِ خستہ کے بغیر۔ کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا۔ کیجئے ہائے ہائے کیا

(۸۹)

غنچۂ ناشگفتہ کو۔ دور سے مت دکھا کہ یوں
بوسے کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یوں

پرسشِ طرزِ دلبری کیجئے کیا کہ بن کہے
اُس کے ہر ایک اشارے سے نکلے ہے یہ ادا کہ یوں

رات کے وقت مے پیئے۔ ساتھ رقیب کو لئے
آئے وہ یاں خدا کرے۔ پر نہ کرے خدا کہ یوں

"غیر سے رات کیا بنی"۔ یہ جو کہا تو دیکھئے
سامنے آن بیٹھنا۔ اور یہ دیکھنا کہ یوں

بزم میں اُس کے روبرو۔ کیوں نہ خموش بیٹھئے
اُس کی تو خامشی میں بھی۔ ہے یہی مدعا کہ یوں

میں نے کہا کہ "بزمِ ناز چاہئے غیر سے تہی"
سُن کے ستم ظریف نے مجھ کو اُٹھا دیا کہ یوں

مجھ سے کہا جو یار نے جاتے ہیں ہوش کس طرح
دیکھ کے میری بیخودی چلنے لگی ہوا کہ یوں

کب مجھے کوئے یار میں رہنے کی وضع یاد تھی
آئینہ دار بن گئی ۔ حیرتِ نقشِ پا کہ یوں
گر ترے دل میں ہو خیال وصل میں شوق کا زوال
موجِ محیطِ آب میں ۔ مارے ہے دست و پا کہ یوں
جو یہ کہے کہ ریختہ کیوں کہ ہو رشکِ فارسی
گفتۂ غالبؔ ایک بار پڑھ کے اُسے سنا کہ یوں

(۸۹)

ملتی ہے خوئے یار سے نار التہاب میں
کافر ہوں ۔ گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں
کب سے ہوں کیا بتاؤں ۔ جہانِ خراب میں
شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں
تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر
آنے کا عہد کر گئے آئے جو خواب میں
قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں وہ جو لکھیں گے جواب میں
مجھ تک کب اُن کی بزم میں آتا تھا دورِ جام؟
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

جو منکرِ وفا ہو فریب اُس پہ کیا چلے
کیوں بدگماں ہوں دوست سے دشمن کے باب میں

میں مضطرب ہوں وصل میں خوفِ رقیب سے
ڈالا ہے تم کو وہم نے کس پیچ و تاب میں؟

میں اور حظِ وصل خدا ساز بات ہے
جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں

ہے تیوری چڑھی ہوئی اندر نقاب کے
ہے اک شکن پڑی ہوئی طرفِ نقاب میں

لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا
لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

وہ نالہ! دل میں خس کے برابر جگہ نہ پائے
جس نالے سے شگاف پڑے آفتاب میں

وہ سحر مدعا طلبی میں نہ کام آئے
جس سحر سے سفینہ رواں ہو سراب میں

غالبؔ چھٹی شراب۔ پر اب بھی کبھی کبھی
پیتا ہوں روزِ ابر و شبِ ماہتاب میں

(۹۰)

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا
یاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں
تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے
تیرا پتا نہ پائیں تو ناچار کیا کریں؟
کیا شمع کے نہیں ہیں ہوا خواہ اہلِ بزم
ہو غم ہی جاں گداز تو غم خوار کیا کریں

(۹۱)

نکوہش ہے سزا فریادیِ بیدادِ دلبر کی
مبادا خندۂ دنداں نما ہو صبحِ محشر کی

رگِ لیلیٰ کو خاکِ دشتِ مجنوں ریشگی بخشے
اگر بووے بجائے دانہ دہقاں نوک نشتر کی

پرِ پروانہ شاید بادبانِ کشتیِ مے تھا
ہوئی مجلس کی گرمی سے روانی دورِ ساغر کی

کروں بیدادِ ذوقِ پرفشانی عرض کیا قدرت
کہ طاقت اڑ گئی اڑنے سے پہلے میرے شہپر کی

کہاں تک روؤں اس کے خیمے کے پیچھے قیامت ہے
مری قسمت میں یارب کیا نہ تھی دیوار پتھر کی

(۹۲)

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے
کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو

اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو		پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار

(۹۳)

تپش سے میری. وقفِ کشمکش ہر تارِ بستر ہے	ہر اسرِ رنجِ بالیں ہے. ہر اتن بارِ بستر ہے
مرا سرِ رنج بر صحرا دادہ. نور العین دامن ہے	دلِ بے دست و پا افتادہ بر خوردارِ بستر ہے
خوشا اقبالِ رنجوری عیادت کو جو تم آئے	فروغِ شمعِ بالیں طالعِ بیدارِ بستر ہے
بہ طوفاں گاہِ جوشِ اضطرابِ شامِ تنہائی	شعاعِ آفتابِ صبحِ محشر تارِ بستر ہے
ابھی آتی ہے بو بالش سے اس کی زلفِ مشکیں کی	ہماری دید کو خوابِ زلیخا. عارِ بستر ہے

کہوں کیا دل کی کیا حالت ہے ہجرِ یار میں غالب
کہ بے تابی سے ہر اک تارِ بستر خارِ بستر ہے

(۹۴)

کبھی نیکی بھی اس کے جی میں گر آجائے ہے مجھ سے
جفائیں کر کے اپنی یاد شرما جائے ہے مجھ سے
خدایا جذبۂ دل کی. مگر تاثیر الٹی ہے
کہ جتنا کھینچتا ہوں اور کھنچتا جائے ہے مجھ سے
نہ بد خو اور میری داستانِ عشق طولانی
عبارت مختصر قاصد بھی گھبرا جائے ہے مجھ سے
ادھر وہ بد گمانی ہے. ادھر یہ ناتوانی ہے

نہ پوچھا جائے ہے اُس سے نہ بولا جائے ہے مجھ سے

سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت ہے
کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

تکلف برطرف نظارگی میں بھی سہی لیکن
وہ دیکھا جائے کب یہ ظلم دیکھا جائے ہے مجھ سے

ہوئے ہیں پاؤں ہی پہلے نبردِ عشق میں زخمی
نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے

قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہم سفر غالبؔ
وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

(٩٥)

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

اک کھیل ہے اورنگِ سلیماں مرے نزدیک
اک بات ہے اعجازِ مسیحا مرے آگے

جز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور
جز وہم نہیں ہستیِ اشیا مرے آگے

ہوتا ہے نہاں گرد میں صحرا مرے نزدیک
گھستا ہے جبیں خاک پہ دریا مرے آگے

مت پوچھ کہ کیا حال ہے میرا ترے پیچھے
تو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے

سچ کہتے ہو خود بین و خود آرا ہوں نہ کیوں ہوں
بیٹھا ہے بتِ آئنہ سیما مرے آگے

پھر دیکھئے اندازِ گل افشانیِ گفتار
رکھ دے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے

نفرت کا گماں گزرے ہے میں رشک سے گزرا	کیونکر کہوں لو نام نہ اُن کا مرے آگے
ایماں مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر	کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے
عاشق ہوں پہ معشوق فریبی ہے مرا کام	مجنوں کو بُرا کہتی ہے لیلےٰ مرے آگے
خوش ہوتے ہیں پر وصل میں یوں مر نہیں جاتے	آئی شبِ ہجراں کی تمنّا مرے آگے
ہے موجزن اک قلزمِ خوں. کاش یہی ہو	آتا ہے ابھی دیکھیے کیا کیا مرے آگے
گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے	رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

ہم پیشہ و ہم مشرب و ہم راز ہے میرا
غالبؔ کو بُرا کیوں کہو اچھا مرے آگے

(۹۶)

ظُلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے	اک شمع ہے دلیلِ سحر. سو خموش ہے
نے مژدۂ وصال نہ نظّارۂ جمال	مُدّت ہوئی کہ آشتیِ چشم و گوش ہے
مَے نے کیا ہے حُسنِ خود آرا کو بے حجاب	اے شوق. یاں اجازتِ تسلیمِ ہوش ہے
گوہر کو عقدِ گردنِ خوباں میں دیکھنا	کیا اوج پر ستارۂ گوہر فروش ہے
دیدار بادہ. حوصلہ ساقی. نگاہ مست	بزمِ خیال. مے کدۂ بے خروش ہے

قطعہ

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل	زنہار اگر تمھیں ہوسِ نائے و نوش ہے
دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو	میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے

ساقی بہ جلوہ دشمنِ ایمان و آگہی
مطرب بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہی

یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہی

لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ
یہ جنتِ نگاہ۔ وہ فردوسِ گوش ہی

یا صبح دم جو دیکھیے آ کر تو بزم میں
نے وہ سرور و شور۔ نہ جوش و خروش ہی

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہی سو وہ بھی خموش ہی

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہی

(۹۷)

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

شرع و آئین پر مدار سہی
ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی

چال۔ جیسے کڑی کمان کا تیر
دل میں ایسے کے جا کرے کوئی

بات پر واں زبان کٹتی ہی
وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

نہ سنو۔ گر برا کہے کوئی
نہ کہو۔ گر برا کرے کوئی

روک لو گر غلط چلے کوئی
بخش دو گر خطا کرے کوئی

کون ہی جو نہیں ہی حاجتمند
کس کی حاجت روا کرے کوئی

کیا کیا خضر نے سکندر سے
اب کسے رہنما کرے کوئی

جب توقع ہی اُٹھ گئی غالبؔ
کیوں کسی کا گلا کرے کوئی

(۹۸) سہرا ۱؎

خوش ہو اے بخت کہ ہے آج ترے سر سہرا
باندھ شہزادے جواں بخت کے سر پر سہرا

کیا ہی اس چاند سے مکھڑے پہ بھلا لگتا ہے
ہے ترے حسنِ دل افروز کا زیور سہرا

سر پہ چڑھنا تجھے پھبتا ہے پر اے طرفِ کلاہ
مجھ کو ڈر ہے کہ نہ چھینے ترا لمبر سہرا

ناؤ بھر کر ہی پروئے گئے ہوں گے موتی
ورنہ کیوں لائے ہیں کشتی میں لگا کر سہرا

سات دریا کے فراہم کیے ہوں گے موتی
تب بنا ہوگا اس انداز کا گز بھر سہرا

رُخ پہ دُولھا کے جو گرمی سے پسینہ ٹپکا
ہے رگِ ابرِ گہربار سراسر سہرا

یہ بھی اک بے ادبی تھی کہ قبا سے بڑھ جائے
رہ گیا آن کے دامن کے برابر سہرا

جی میں اترائیں نہ موتی کہ ہمیں ہیں اک چیز
چاہیے پھولوں کا بھی ایک مُکرّر سہرا

جبکہ اپنے میں سماویں نہ خوشی کے مارے
گوندھے پھولوں کا بھلا پھر کوئی کیونکر سہرا

رُخِ روشن کی دمک گوہرِ غلطاں کی چمک
کیوں نہ دکھلائے فروغِ مہ و اختر سہرا

تارِ ریشم کا نہیں ہے یہ رگِ ابرِ بہار
لائے گا تابِ گراں باریِ گوہر سہرا

۱؎ غالبؔ نے یہ سہرا ابوظفر بہادر شاہ کے چھوٹے بیٹے جوان بخت کی شادی کے موقع پر لکھا تھا مقطع کو سُن کر بادشاہ نے خیال کیا کہ مقطع میں اس کے استاد ذوقؔ پر تعریض کی گئی ہے چنانچہ بادشاہ کے ایما سے استاد ذوق نے بھی اسی ردیف قافیہ میں ایک اور سہرا لکھا تھا
(ملاحظہ ہو صفحہ ۹۰ پر)

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں
دیکھیں اس سہرے سے لکھ دے کوئی بڑھ کر سہرا

(۹۹) سہرا جو ذوق نے جواب میں لکھا

اے جواں بخت مبارک تجھے سر پہ سہرا
آج ہے یمن و سعادت کا ترے سر سہرا

آج وہ دن ہے کہ لائے دُرِ انجم سے فلک
کشتیِ زر میں مہِ نو کی لگا کر سہرا

تابشِ حُسن سے مانندِ شعاعِ خورشید
رُخِ پُر نور پہ ہے تیرے منوّر سہرا

وہ کہے صلِ علےٰ یہ کہے سبحان اللہ
دیکھیں مکھڑے پہ جو تیرے مہ و اختر سہرا

تلمے اور بنی میں رہے اخلاص باہم
گوندھتا ہے سورۂ اخلاص کو پڑھ کر سہرا

دھوم ہے گلشنِ آفاق میں اس سہرے کی
گائیں مرغانِ نوا سنج نہ کیونکر سہرا

روئے فرخ پہ جو ہیں تیرے برستے انوار
تارِ بارش سے بنا ایک سراسر سہرا

ایک کو ایک پہ تزئیں ہے دمِ آرائش
سر پہ دستار ہے دستار کے اوپر سہرا

اک گہر بھی نہیں صد کانِ گہر میں چھوڑا
تیرا بنوایا ہے لے کے جو گوہر سہرا

پھرتی خوشبو سے ہے اتراتی ہوئی بادِ بہار
اللہ اللہ رے پھولوں کا معطّر سہرا

سر پہ طرّہ ہے مزیّن تو گلے میں بدھی
کنگنا ہاتھ میں زیبا ہے تو سر پر سہرا

رونمائی میں تجھے دے مہ خورشید فلک
کھول دے مُنہ کو جو تو مُنہ سے ہٹا کر سہرا

کثرتِ تارِ نظر سے ہے تماشائیوں کے
دمِ نظارہ ترے روئے نکو پر سہرا

دُرِ خوش آب مضامیں سے بنا کر لایا
واسطے تیرے ترا ذوق ثنا گستر سہرا

جن کو دعویٰ ہو سخن کا یہ سنا دو اُن کو
دیکھو اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا

(۱۰۰) قطعہ ؎

منظور ہے گزارشِ احوالِ واقعی
اپنا بیانِ حُسنِ طبیعت نہیں مجھے

سو پُشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

آزادہ رو ہوں اور مرا مسلک ہے صلحِ کل
ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے

کیا کم ہے یہ شرف کہ ظفر کا غلام ہوں
مانا کہ جاہ و منصب و ثروت نہیں مجھے

اُستادِ شہ سے ہو مجھے پرخاش کا خیال
یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے

جامِ جہاں نما ہے شہنشاہ کا ضمیر
سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے

میں کون اور ریختہ ہاں اس سے مُدّعا
جز انبساطِ خاطرِ حضرت نہیں مجھے

سہرا لکھا گیا زرہِ امتثالِ امر
دیکھا کہ چارہ غیر اطاعت نہیں مجھے

مقطع میں آپڑی ہے سخن گسترانہ بات
مقصود اس سے قطعِ محبت نہیں مجھے

روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ
سودا نہیں جنوں نہیں وحشت نہیں مجھے

قسمت بُری سہی پہ طبیعت بُری نہیں
ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے

صادق ہوں اپنے قول میں غالبؔ خدا گواہ
کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

؎ مرزا نے اپنے سہرے کے جواب میں اُستاد ذوق کا سہرا سُن کر اس قطعے کو بادشاہ کے حضور میں پیش کیا تھا۔

(۳۲) ثاقب ۱۸۶۹ء

شہاب الدین خاں خلف الرشید نواب ضیاء الدین خاں متخلص بہ نیر رئیس لوہارو۔ دہلی کے نامور روساء میں تھے۔ مرزا غالب مرحوم کے عزیز تھے اور شاعری میں اُنہیں سے تلمذ تھا۔ آپ اعلیٰ درجہ کا علمی مذاق رکھتے تھے۔ فارسی اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ مرزا غالب کو ان کے ساتھ بڑی ہمدردی تھی بہ عالم جوانی ۱۲۸۶ھ مطابق ۱۸۶۹ء میں وفات پائی۔ اُن کے بیٹے نواب شجاع الدین خاں تاباں اور نواب سراج الدین احمد خاں سائل[۵] اس وقت موجود ہیں نمونہ کلام یہ ہے:-

(۱۰۱) غزل

ہم قوتِ جذبِ دل دکھائیں — اور پھر وہ ہمارے گھر نہ آئیں
کیا چیر کے سینہ دل دکھائیں — کچھ حال سنو تو ہم سنائیں
ای بخت کہاں تلک برائی — ای چرخ کہاں تلک جفائیں
ہم سینہ سپر کئے کھڑے ہیں — وہ شوق سے خنجر آزمائیں
جو کام ہیں غیر کے ہوئیں صرف — افسوس وہ دلربا ادائیں

شاید کہ ہی گرم نالہ ثاقب
چلتی ہیں شرر فشاں ہوائیں

[۵] انتقال ہوگیا

(۱۰۲)

فکرِ وصال ہجر کا صدمہ اُٹھائیے	اس چند روزہ زیست میں کیا کیا اُٹھائیے
بے لطف زندگی سے تو مرنا ہی خوب ہے	کہ نامہ کہ ناز مسیحا اُٹھائیے
آؤ نہ آؤ ہم بھی ہیں خوگر شکیب کے	جی چاہتا ہے ذوق تمنّا اُٹھائیے
رکھتے ہیں لوگ خلوتِ دشمن کا اہتمام	بے پردگی ہیں پردہ ہی پردہ اُٹھائیے

بیٹھے ہیں اب تو ہم دلِ بے آرزو لئے
وہ دن گئے کہ داغ تمنّا اُٹھائیے

(۳۳) شیفتہ ۱۸۶۹ء

نواب محمد مصطفےٰ خاں خلف نواب اعظم الدولہ سرفراز الملک مرتضےٰ خاں بہادر رئیس دہلی و تعلقہ دار جہانگیر آباد ضلع بلند شہر۔ آپ نواب الٰہی داد خاں مرحوم خاندان بنگش کی اولاد میں تھے ۱۸۰۶ء میں دہلی میں پیدا ہوئے مشہور معلمین اور کاملین سے عربی فارسی پڑھی آپ کو علوم مروجہ میں اعلیٰ درجہ کی لیاقت حاصل تھی۔ غدر سے پہلے دہلی میں مستقل سکونت تھی اور وہاں کی سوسائٹی سے بہرہ اندوز تھے ۱۸۵۷ء کے بعد سے جہانگیر آباد میں رہنے لگے اور شاعری کو خیرباد کہہ دی۔ آپ اردو کی طرح فارسی میں بھی زبردست شاعر اور صاحب دیوان تھے اور حسرتی تخلص کرتے تھے۔ حکیم مومن خاں صاحب مومن دہلوی کے شاگرد تھے اور ان کی وفات کے بعد حضرت غالب سے مشورہ سخن رکھتے تھے دیوان

ریختہ میں حکمت. تصوف. اخلاق حسن وعشق کے جذبات اور ہر قسم کے مضامین موجود ہیں اور ہر موقع پر سنجیدگی اور متانت کا خیال رکھا ہے ۱۲۵۰ھ میں آپ نے تذکرۂ گلشن بیخار مرتب کیا تھا جس میں اردو شعراء کے حالات اور کلام درج ہے۔ اردو زبان کا یہ پہلا تذکرہ ہے جس میں شعراء کے کلام پر آزادانہ رائے بھی دی گئی ہے آپ نے ۱۲۸۶ھ مطابق ۱۸۶۹ء میں انتقال فرمایا. آپ کی کلیات جس میں فارسی اردو کا کلام اور واقعات شیفتہ بزبان فارسی شامل ہیں مع مصنف کی سوانح عمری اور فارسی و اردو کے کلام پر ایک مبسوط تنقید کے مولانا نظامی بدایونی نے مرتب کیا ہے۔ جو نواب صاحب کے صاحبزادہ نواب محمد اسحاق خاں صاحب مرحوم کے ایماء سے نظامی پریس بدایوں میں نہایت اہتمام کے ساتھ چھپ کر ۱۹۱۵ء میں شائع ہوئی. کلام کا نمونہ یہ ہے:۔

غزل (۱۰۳)

ساقی کو مے کی دھن میں ہمہ ناؤ نوش ہے — صوفی کو خانقہ میں ہمہ وجد و حال ہے

عاشق کو اضطراب ہے عجز و نیاز سے — معشوق کو غرور ہے غنج و دلال ہے

منظور ہے حکیم کو ہر شے کی معرفت — حالانکہ اپنی معرفت اس کو محال ہے

ہر کام فلسفی کا سفاہت کے ساتھ ہے — ہر بات منطقی کی مراد جدال ہے

ارباب حکمت نظری کو عمل نہیں — اہل کلام کو ہوس قیل و قال ہے

جن کو کہ دستگاہ ہے فن نجوم میں — عمران کی صرف زائچہ ماہ و سال ہے

ہیں بعض لوگ در پئے اسراف رات دن — بعضوں کو روز و شب ہمہ توفیر مال ہے

بعضوں کو ہے مذاق میں فخر نسب لذیذ
بعضوں کو ذوق دعوئ فضل و کمال ہے

مفلس کو فکر ہے کہ کسی ڈھب سے کچھ ملے
منعم غریق لجۂ بیم زوال ہے

جو ہیں مریض سیر چمن ان کو بزم میں
ذکر شجر کبھی کبھی فکر نہال ہے

جی میں کسی کے خواہش آرایش لباس
دل میں کسی کے حسرت جاہ و جلال ہے

کوئی طالب ہیں شاہد گلگوں نظیر کا
کوئی اسیر شوق شکار غزال ہے

کوئی فدائے قامت آفت خرام ہے
کوئی خراب نرگس جادو مثال ہے

ناحق کسی کو شکر کسی کو شکایتیں
بے وجہ کوئی خوش ہے کسی کو ملال ہے

کس واسطے ہم آئے ہیں دنیا میں شیفتہ
اس کا جو دیکھئے تو بہت کم خیال ہے

غزل (۱۰۴)

کل نغمہ گو جو مطرب جادو ترانہ تھا
ہوش و حواس و عقل و خرد کا پتا نہ تھا

یہ بت کہ جائے شب ہے جیسا تھا نقاب میں
عہد شباب اور بتوں کا زمانہ تھا

معلوم ہے سنانے ہو پھر آگ بہلانے سے
ٹھہرا نہ آئے رات حنا کا بہانہ تھا

حسرت سے اس کے کوچہ کو کیونکر نہ دیکھئے
اپنا بھی اس چمن میں کبھی آشیانہ تھا

کیا غم کہ روز میں ہے کہ مدارس میں وہ نہیں
البتہ ایک اس دل بے مدعا نہ تھا

ساقی کی بے ... تو بھی بات رات کو
مطرب اگرچہ کام میں اپنے یگانہ تھا

کچھ آج ان کی بزم میں بیٹھا ... نیست
آلودہ مے سے دامن پاک صیانہ تھا

دشمن کے فعل کی تمھیں توجیہ کیا ضرور
تم سے فقط مجھے گلۂ دوستانہ تھا

کل شیفتہ سحر کو عجب حالِ خوش میں تھے
آنکھوں میں نشہ اور لبوں پر ترانہ تھا

(۱۰۵) قطعہ

کہا کل میں نے اے سرمایۂ ناز
تلوّن سے ہی تم کو مدعا کیا

کبھی مجھ پر عتابِ بے سبب کیوں
کبھی بے وجہ غیروں سے وفا کیا

کبھی محفل میں وہ بیباکیاں کیوں
کبھی خلوت میں یہ شرم و حیا کیا

کبھی تمکین صولت آفریں کیوں
کبھی الطافِ جرأت آزما کیا

کبھی وہ طعنہ ہائے جانگزا کیوں
کبھی یہ غمزہ ہائے جانفزا کیا

کبھی شعروں سے میری نغمہ سازی
کبھی کہنا کہ یہ تم نے کہا کیا

کبھی بے جرم یہ آزردہ ہونا
کہ کیا طاقت جو پوچھوں میں خطا کیا

کبھی اس دشمنی پر بہر تسکیں
پئے ہم جلوہ ہائے دلربا کیا

یہ سب طول اس نے سن کر بے تکلف
جواب اک مختصر مجھ کو دیا کیا

ابھی اے شیفتہ واقف نہیں تم
کہ باتیں عشق میں ہوتی ہیں کیا کیا

(۳۴) شوق ۱۸۷۱ء

حکیم تصدق حسین خاں صاحب۔ نواب مرزا آغا علی خاں لکھنوی صاحب تذکرہ سخن شعرا نے اُن کو آتش کا شاگرد لکھا ہے اس کے سوا اور کوئی تحقیق نہیں۔ زہر عشق۔ بہار عشق۔ فریب عشق۔ لذت عشق کے مصنف تھے۔ ان مثنویوں کو تصنیف ہوئے قریب ۶۰ سال کے گزرے۔ مثنوی زہر عشق کا سال تصنیف ۱۲۷۷ھ غم دلربا ہے برآمد ہوتا ہے طرز بیان سلیس ہے۔ لکھنؤ کے محاورات۔ روزمرہ بول چال۔ ضرب الامثال کے ساتھ ہی ساتھ جذبات کی تصویر خوب کھینچی ہے ان سب مثنویوں میں زہر عشق اپنے واقعہ کے لحاظ سے زیادہ دل گداز ہے۔ ایک موقعہ پر اس میں دُنیا کی بے ثباتی کا جو نقشہ دکھایا ہے خوب ہے تقریباً ۱۲۸۸ھ مطابق ۱۸۷۱ء میں انتقال ہوا۔ زہر عشق کا انتخاب یہ ہے۔

(۱۰۶)

اقربا میرے ہو گئے آگاہ — تم سے ملنے کی اب نہیں کوئی راہ

مشورے ہو رہے ہیں آپس میں — بھیجتے ہیں مجھے بنارس میں

گو ٹھکانے نہیں ہیں ہوش و حواس — پر یہ کہنے کو آئی ہوں ترے پاس

جائے عبرت سرائے فانی ہے — موردِ مرگ نوجوانی ہے

اونچے اونچے مکاں تھے جن کے بڑے — آج وہ تنگ گور میں ہیں پڑے

کل جہاں پر شگوفہ و گل تھے ۔۔۔ آج دیکھا تو خار بالکل تھے

جس چمن میں تھا بلبلوں کا ہجوم ۔۔۔ آج اُس جا ہے آشیانۂ بوم

بات کل کی ہے نوجواں تھے جو ۔۔۔ صاحبِ نوبت و نشاں تھے وہ

آج خود ہیں نہ ہے مکاں باقی ۔۔۔ نام کو بھی نہیں نشاں باقی

غیرتِ حورِ مہ جبیں نہ رہے ۔۔۔ ہیں مکاں گر تو وہ مکیں نہ رہے

جو کہ تھے بادشاہِ ہفت اقلیم ۔۔۔ ہوئے جا جا کے زیرِ خاک مقیم

کوئی لیتا نہیں اب اُس کا نام ۔۔۔ کون سی گور میں گیا بہرام

اب نہ رستم نہ سام باقی ہے ۔۔۔ اک فقط نام ہی نام باقی ہے

کل جو رکھتے تھے اپنے فرق پہ تاج ۔۔۔ آج وہ فاتحہ کو ہیں محتاج

تھے جو خودسر جہاں میں مشہور ۔۔۔ خاک میں مل گیا سب اُن کا غرور

عطر مٹی کا جو نہ ملتے تھے ۔۔۔ نہ کبھی دھوپ میں نکلتے تھے

گردشِ چرخ سے ہلاک ہوئے ۔۔۔ استخواں تک بھی اُن کے خاک ہوئے

تھے جو مشہور قیصر و مغفور ۔۔۔ باقی اُن کا نہیں نشانِ قبور

تاج میں جن کے ٹکتے تھے گوہر ۔۔۔ ٹھوکریں کھاتے ہیں وہ کاسۂ سر

نہ رہے یوسف جو تھے جہاں میں حسیں ۔۔۔ کھا گئے اُن کو آسمان و زمیں

ہر گھڑی منقلب زمانہ ہے ۔۔۔ یہی دنیا کا کارخانہ ہے

ہے نہ شیریں نہ کوہ کن کا پتا ۔۔۔ نہ کسی جا ہے نل دمن کا پتا

بوئے اُلفت تمام پھیلی ہی
صبح کو طائرانِ خوش الحان
موت سے کس کو رستگاری ہی
زندگی بے ثبات ہی اس میں
ہم بھی گر جان دیں کھا کر سم
دل کو سمجھا لیوں میں بہلاتا
جا کے رہتا نہ اس مکاں سے دور
روح بھٹکے گی گھر نہ پائے گی
روکے رہتا بہت طبیعت کو
ضبط کرتا اگر نہ ٹال رہے
میرے مرنے کی جب خبر پاتا
جمع ہوویں سب اقربا جس دم
کہے دیتی ہوں جی نہ کھوتا تم
ہو گئے تم اگرچہ سودائی
لاکھ تم کچھ کہو نہ مانیں گے
طعنہ زن ہوں گے سب امیر و غریب
سامنا ہو ہزار آفت کا

باقی اب قیس ہی نہ لیلیٰ ہی
پڑھتے ہیں کُل من علیہا فان
آج وہ کل ہماری باری ہی
موت عین حیات ہی اس میں
تم نہ رونا ہمارے سر کی قسم
یا مری قبر پہ چلے آنا
ہم جو مر جائیں تیری جاں سے دور
ڈھونڈھتے کس طرف کو جائے گی
یاد رکھنا مری نصیحت کو
میری رسوائی کا خیال رہے
یوں نہ دوڑے ہوئے چلے آنا
رکھنا اُس وقت تم وہاں پہ قدم
ساتھ تابوت کے نہ روتا تم
دور رہنا پہنچے گی میری رسوائی
لوگ عاشق ہمارا جانیں گے
قبر پر بیٹھنا نہ ہو کے فقیر
پاس رکھنا ہماری عزت کا

جب جنازہ مرا عزیز اٹھائیں — آپ بیٹھے وہاں نہ اشک بہائیں
میری منت یہ دھیان رکھیے گا — بند اپنی زبان رکھیے گا
تذکرہ کچھ نہ کیجیے گا مرا — نام منہ سے نہ لیجیے گا مرا
اشک آنکھوں سے مت بہائیے گا — ساتھ غیروں کی طرح جائیے گا
آپ کاندھا نہ دیجیے گا مجھے — سب میں رسوا نہ کیجیے گا مجھے
رنگ دل کے بدل نہ جائیں کہیں — منہ سے نالے نکل نہ جائیں کہیں
ساتھ چلنا نہ سر کے بال کھلے — تا کسی شخص پر نہ حال کھلے
ہوتے آتش کے ہیں یہ پرکالے — تاڑ جاتے ہیں تاڑنے والے
ذکر سن کر مرا نہ رو دینا — میری عزت نہ یوں ڈبو دینا
رنج فرقت مرا اٹھا لینا — جی کہیں اور جا لگا لینا
رنج کرنا نہ میرا میں قربان — سن لو اگر اپنی جان ہے تو جہاں
دل میں گھٹنا نہ مجھ سے چھوٹ کے تم — جان دینا نہ گھونٹ گھونٹ کے تم
آ کے رو لینا میری قبر کے پاس — تا نکل جائے تیرے دل کی بھڑاس
آنسو چپکے سے دو بہا لینا — قبر میری گلے لگا لینا
اگر آ جائے کچھ طبیعت پر — پڑھنا قرآن میری تربت پر
غنچۂ دل مرا کھلا جانا — پھول تربت پہ دو چڑھا جانا
ہے یہ حاصل سب اتنی باتوں سے — مٹی دینا تم اپنے ہاتھوں ہر

عمر بھر کون کس کو روتا ہی	کون صاحب کسی کا ہوتا ہی
کبھی آجائے گر ہمارا دھیان	جان تا ہم پہ ہوگئی قربان
دل میں کچھ آتے دیجیو نہ ملال	خواب دیکھا تھا کیجیو یہ خیال
مرگ کا کس کو انتظار نہیں	زندگی کا کچھ اعتبار نہیں

(۳۵) نظام ۱۸۷۲ء

بیان نظام علی شاہ خلف سید احمد شاہ۔ آپ ریاست رامپور کے سادات سے تھے۔ آزادمنش آشفتہ مزاج۔ رندانہ طبیعت رکھتے تھے۔ عاشقانہ معاملات کو خوب لکھتے تھے ابتدائی کلام شیخ علی بخش بیمار کو دکھایا۔ پھر نواب رامپور یوسف علی خاں بہادر ناظم سے اصلاح لی ۲۵ شعبان ۱۲۸۹ھ مطابق ۱۸۷۲ء کو وفات پائی دیوان مرنے کے بعد ریاست رامپور میں شائع ہوچکا ہی۔ نمونہ کلام یہ ہی:-

(۱۰۰) غزل

جو سرگذشت اپنی ہم کہیں گے۔ کوئی سنے گا تو کیا کریں گے
جو یاد آئیں گی تیری باتیں تو پہروں چپکے ہی رہا کریں گے
الٰہی قاصد ابھی نہ آئے کہ یہ توقع بھی ہے غنیمت
کیا گر انکار وصلت اس نے تو دل کو تسکیں کیا کریں گے

عبث یہ ہر دم کا چونکنا ہی۔ عبث یہ اُٹھ اُٹھ کے دیکھنا ہے
بھلا وہ ایسے ہوئے تھے کس دن وہی تو وعدہ وفا کریں گے

یہ سچ ہی ناصح نہ ہوگا ملنا نہیں ہی اچھا نہ ہوگا اچھا
پھر آپ کو کیا، بُرا کریں گے تو اپنے حق میں بُرا کریں گے

نظام۔ تقریر پھر عبث ہی جواب کچھ اس کا دے سکو گے
وہ اُس کا ہر بات پر یہ کہنا کہ ہم تو اپنا کہا کریں گے

(۳۶) مہر ۱۸۷۳ء

میرزا حاتم علی خلف میرزا فیض علی قزلباش۔ آپ اکبر آباد کے مشہور رؤسا سے تھے۔ فن سخن میں شیخ امام بخش ناسخ کے تلمیذ رشید تھے۔ رعایت کے دلدادہ تشبیہات اور استعارات کے مرد میدان میرزا غالب کے دوست تھے۔ غدر سے پہلے چیا ریں منصف رہے۔ ۱۸۷۳ء میں زندہ تھے۔ ان کا دیوان چھپ چکا ہی۔ کلام کا انتخاب یہ ہی:-

(۱۰۸) غزل

گریباں ہاتھ میں ہی پاؤں میں صحرا کا داماں ہی	بس اب پاؤں میں اپنے اور سر خار مغیلاں ہی
کہاں یہ ابر دیئے خمار کب یہ چشم فتاں ہی	بیابان چشم آہویاں کتاب طاق نسیاں ہی
جلاتا ہی یہ پروانوں کو وصف شعلہ رویاں ہے	زبان خامہ بھی اپنی زبان شمع سوزاں ہی

ہوائے وحشت ہم کو لے اڑتی ہے بستی سے جیسے اہل ریاضی برج آبی کہتے ہیں شبابی سبق کو دیکھتا ہوں رات بھر اوپر الجھتا ہوں	ہمارا عنصر ِ خاکی مگر ریگ بیاباں ہے وہ سانحہ پڑے آنسو ڈھلنے کا چشم گریاں ہے مطول مختصر وہ شرح زلف پیچاں ہے

نہ کیوں ہر طرز میں پڑھتا غزل اس ماہ کے آگے
ہر استاد ِ کامل مہر تا صبح ساسنحاں ہے

(۳۶) دبیر ۱۸۷۴ء

دبیر میرزا سلامت علی۔ خلف میرزا غلام حسین ان کے آباؤ اجداد کا وطن دہلی تھا مگر میرزا انیس ہی کی طرح ان کا بھی آفتاب سخن لکھنؤ میں طلوع ہوا۔ شاعری میں میر مظفر حسین صاحب ضمیر کے شاگرد تھے۔ مرثیہ گوئی میں میر انیس کے ہم مقابل تھے اور اصل یہ ہے کہ دونوں آفتاب و ماہتاب تھے جس طرح میر انیس کی فصاحت مسلمہ ہے اسی طرح آپ کی بلاغت۔ ان کے مرثیے کئی جلدوں میں طبع ہو چکے ہیں ۲۹ محرم ۱۲۹۱ھ مطابق ۱۸۷۴ء کو انتقال فرمایا۔ نمونہ کلام یہ ہے:۔

(۱۰۹) تلوار

جب مورچے پہ لیلیٔ تیغ دو سر گئی ہر صف میں خاک اڑا گئے ادھر گئی ادھر گئی	چنگلے پھلوں کو سائے سے بتوانہ کر گئی پھر یہ نہا نہا کے لہو میں نکھر گئی

عالم نہ پوچھو قطرہ فشانی کے حسن کا
جوبن ٹپک رہا تھا جوانی کے حسن کا

آگے کبھی بڑھی۔ کبھی پیچھے کو پھر پڑی
تجویز جو لعینوں نے کی وہ مفر پڑی
سر پر جو لڑکھڑائی تو شانوں پہ گر پڑی
اُفتاد اُن سے پوچھئے یہ جن کے سر پڑی
اُٹھی، گری، بلند ہوئی، پست ہوگئی
پی پی کے سرکشوں کا لہو مست ہوگئی

(۱۱۰) رجز

ہم دل ہیں جیت رآہیں گے فوجِ شریر کے
ٹکڑے کریں گے خنجر و شمشیر و تیر کے
جوہر کھلیں گے طاقتِ بازوئے پیر کے
وارث ہیں ذوالفقارِ جنابِ امیر کے
اک اک کی موت آج حسامِ دو سر سے ہے
قبضہ قضا کی تیغ پہ حکمِ قدر سے ہے

(۱۱۱) علی اصغر کی فرقت میں ماں کی بیتابی

بانو پچھلے پہر اصغر کے لیے روتی ہے
سر کو کبھی پیٹتی ہے جاں کو کبھی کھوتی ہے
ایک وہ جاگتی ہے خلقِ خدا سوتی ہے
یہ عجب غم ہے کہ تسکین نہیں ہوتی ہے
پیٹتے پیٹتے بے ہوش جو ہو جاتی ہے
دل سے ہے ہے علی اصغر کی صدا آتی ہے
سوگ کا فرش ہے اور سامنے جلتا ہے چراغ
بازوؤں میں داغِ رسن سینے میں اولاد کا داغ

جان اندوہ میں، دل رنج میں، آشفتہ دماغ
نہ وہ گُل ہیں، نہ وہ غنچے نہ ہی زہرا کا وہ باغ

گوشہ چادر کا اگر میرے سر کے جاتا ہے
ننگے سر کوفہ میں پھرنا اُسے یاد آتا ہے

ہائے اصغر! نہ ترا دین ہوا، چُھٹے سے اذا
نہ تری سال گرہ کی، نہ ترا بیاہ کیا
بوجھ کوئی مری گردن سے نہ اُترا تیرا
نہ لحد تجھ کو ملی، اور نہ کفن تجھ کو ملا

ذبح تم ہو گئے سینے پہ لٹاؤں کس کو؟
چھوٹے چھوٹے یہ سلوکے میں پہناؤں کس کو

(۱۱۲) شیریں سید الشہدا کی یاد میں

شیریں کو عجب اُلفتِ اسلام امم تھی
آنکھ اُس کی سوئے صورتِ بانوئے عجم تھی
ہر دم شہِ والا کی وہ مشتاقِ قدم تھی
پتلی صفتِ قبلہ نما سوئے حرم تھی

غش کرتی تھی اسرارِ امامِ دوجہاں پر
اس کی نہ خبر تھی کہ سر آئے گا سناں پر

ڈیوڑھی پہ سارا نور کے تڑکے اُسے آنا
کہ صبح سے مولا کے لئے فرش بچھانا
اور شام کو دروازے سے لئے شمع ہوئے جانا
اور شام کے نزدیک بصد یاس اُٹھانا

شہ کے لئے تیار کبھی کرتی غذا کو
مولا جو نہ آتے تو کھلا دیتی گدا کو

ناگاہ ہوا شاہ سے برگشتہ زمانا
جانا نہ کیا شرز نا پیمبر کا ستانا

مُسلم کا مدینہ سے ہوا کوفہ کو آنا | آخر کو ہوئے شاہ بھی یثرب سے روانہ

واں نکلے نبی قبر سے اور شاہ وطن سے
یاں روح نکلنے لگی شیریں کے بدن سے

تقدیر وہاں دربدر آقا کو پھراتی | شیریں یہاں در پر کبھی آتی کبھی جاتی
گھبرا کے کبھی کوہ سے نیچے اُتر آتی | رہ گیروں کو جاجا کے سرِ راہ سناتی

دُنیا میں ہیں ہوں اور نہیں دُنیا کی خبر ہے
لوگو تمہیں کچھ دلبرِ زہرا کی خبر ہے

پائی جو نہ اُس نے خبرِ سبطِ پیمبرؐ | وہی حجرہ سے ہوئی نازک لذات وہ مضطر
کچھ پی لیا کچھ کھا لیا جو آیا میسر | سونے کے لئے فرش زمیں دونوں برابر

اندیشوں نے بے حال کو تبدیل کیا تھا
پوشاک بدلنا بھی غرض چھوڑ دیا تھا

ہمسائیاں کہتی تھیں بنایا ہے یہ کیا حال | پوشاک جو میلی ہے تو اُلجھے ہوئے ہیں بال
وہ کہتی تھی نیرنگ نظر آتا ہے امسال | دریافت مجھی کو نہیں ہوتا مرا احوال

پوشاک کی کچھ مجھ کو خبر ہے نہ دوا کی
اللہ بس اب خیر کرے آلِ عبا کی

(۳۸) انیس ۱۸۷۵ء

میر ببر علی خلف میر مستحسن خلیق۔ میر حسن مُصنّف مثنوی سحر البیان کے پوتے تھے

بزرگوں کا اصلی وطن دہلی تھا مگر میر صاحب نے لکھنؤ میں تعلیم و تربیت حاصل کی۔ ان کے مراثی نے اردو زبان میں رزمیہ نظم کی کمی کو پورا کر دیا۔ اخلاقی خیالات و اعلیٰ خیالات نے ان کی شاعری کا مرتبہ بلند کر دیا ہے۔ میرزا دبیر مرحوم ان کے ہمعصر تھے۔ دونوں باکمالوں نے اردو نظم کی تاریخ میں ایک ایسا ہنگامہ برپا کر دیا تھا کہ "معنی یابی اور الفاظ پرستی" کی جنگ کہنا زیادہ بجا نہیں۔ ان کے زمانہ میں اردو ادب کے ترقی خواہوں میں دو فریق پیدا ہو گئے تھے جو انیسیئے اور دبیریئے کہلاتے تھے۔ انیس کے ماننے والے بے ساختہ پن اور سوز و گداز کے شیدائی تھے۔ دبیر کے پیرو شوکت الفاظ، مبالغہ، صنائع و بدائع کو شاعری کا حسن سمجھتے تھے۔ شمس العلماء مولانا شبلی نے ان کے انتقال سے کم و بیش تیس سال کی مدت کے بعد ہمارے زمانہ میں موازنہ انیس و دبیر لکھ کر اس بحث کو کہ اردو شاعری کی اس خاص صنف میں ان دونوں شاعروں میں سے کس کا پایہ اونچا تھا تازہ کر دیا تھا اور انیس کے حق میں فیصلہ دے کر انھوں نے ان اعتراضات کی جو نساخ نے طومار اغلاط" میں دبیر کے کلام پر کیے ہیں ایک حد تک تائید کی تھی لیکن مولوی نظیر حسن جہانی نے المیزان شائع کر کے ان دونوں باکمالوں کی بابت ایسی منصفانہ رائے کا اظہار کیا ہے جو ہم نے قائم کی ہے۔ مراثی انیس کا مجموعہ چار جلدوں میں نولکشور پریس لکھنؤ نے عرصہ ہوا شائع کر دیا تھا لیکن حال میں نئی ترتیب و تصحیح کے ساتھ مولانا علی حیدر صاحب طباطبائی نے مراثی انیس کو تین جلدوں میں مرتب کیا ہے جس کی پہلی جلد میں میر صاحب کی آخری عمر کا کلام ہے اور دوسری جلد میں زمانہ شباب کا اور تیسری جلد میں متوسط عمر کا کلام ہے جو نظامی پریس بدایوں سے شائع ہو چکے ہیں۔

۲۹ شوال ۱۲۹۱ھ مطابق ۱۰ دسمبر ۱۸۷۴ء کو میر صاحب نے انتقال کیا ۷۲ برس کی عمر پائی۔ نمونہ کلام یہ ہے۔

(۱۱۳) صبح

چلنا وہ بادِ صبح کے جھونکوں کا دم بدم مرغانِ باغ کی وہ خوش الحانیاں بہم
وہ آب و تابِ نہر وہ موجوں کا پیچ و خم سردی ہوا میں پر نہ زیادہ بہت نہ کم
کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا
تھا موتیوں سے دامنِ صحرا بھرا ہوا

وہ صبح اور وہ چھاؤں ستاروں کی اور وہ نور دیکھے تو غش کرے ارنی گوئے اوجِ طور
پیدا گلوں سے قدرتِ اللہ کا ظہور وہ جا بجا درختوں پہ تسبیح خوانِ طیور
گلشن خجل تھے وادیِ مینو اساس سے
جنگل تھا سب بسا ہوا پھولوں کی باس سے

ٹھنڈی ہوا وہ سبزۂ صحرا کی وہ لہک شرمائے جس سے اطلسِ زنگاریِ فلک
وہ جھومنا درختوں کا پھولوں کی وہ مہک ہر برگِ گل پہ قطرۂ شبنم کی وہ جھلک
ہیرے خجل تھے گوہرِ یکتا نثار تھے
پتے بھی ہر شجر کے جواہر نگار تھے

(۱۱۴) گرمی کی شدت

شیر اٹھتے تھے نہ خوف کے مارے کچھار سے آہو نہ منہ نکالتے تھے سبزہ زار سے

آئینہ مہر کا تھا مکدّر غبار سے
گردوں کو تپ چڑھی تھی زمیں کے بخار سے

گرمی سے مضطرب تھا زمانہ زمین پر
بھُن جاتا تھا جو گرتا تھا دانہ زمین پر

گرداب تھا شعلۂ جوالہ کا گماں
انگارے تھے حباب تو پانی شرر فشاں
مُنہ سے نکل پڑی تھی ہر اک موج کی زباں
تہہ میں تھے سب نہنگ مگر تھی لبوں پہ جاں

پانی تھا آگ گرمیِ روزِ حساب تھی
ماہی جو موجِ سیخ تک آئی کباب تھی

(۱۱۵) تلوار

بے پاؤں جدھر ہاتھ سے چلتی ہوئی آئی
ندی اِدھر اک خوں کی اُبلتی ہوئی آئی
دم بھر میں وہ سو رنگ بدلتی ہوئی آئی
پی پی کے لہو لعل اُگلتی ہوئی آئی

ہیرا تھا بدن زنگ زمرد سے ہرا تھا
جوہر جو کہو پیٹ جواہر سے بھرا تھا

پہونچی جو سپر تک تو کلائی کو نہ چھوڑا
ہر ہاتھ میں ثابت کسی گھاتی کو نہ چھوڑا
شوخی کو شرارت کو لڑائی کو نہ چھوڑا
تیزی کو رکھائی کو صفائی کو نہ چھوڑا

اعضائے بدن قطع ہوئے جاتے تھے سب کے
قینچی سی زباں چلتی تھی فقرے تھے غضب کے

(۱۱۶) مسافرت

دُکھ دیتے ہیں ایک ایک قدم پاؤں کے چھالے
منزل پہ پہنچنے کے بھی پڑ جاتے ہیں لالے

ہاتھوں سے اگر بیٹھ کے کانٹوں کو نکالے
ڈر ہے کہ نہ بڑھ جائیں کہیں قافلے والے

درماندوں کے لینے کو بھی آتا نہیں کوئی
تھک کر کبھی جو بیٹھیں تو اُٹھاتا نہیں کوئی

(۱۱۷) سلام

گنہ کا بوجھ جو گردن پہ ہم اُٹھا کے چلے
خدا کے آگے خجالت سے سر جھکا کے چلے

کسی کا دل نہ کیا ہم نے پائمال کبھی
چلے جو راہ تو چیونٹی کو ہم بچا کے چلے

مقام یوں ہوا اس کارگاہِ دنیا میں
کہ جیسے دن کو مسافر سرا میں آ کے چلے

طلب سے عار ہے اللہ کے فقیروں کو
کبھی جو ہو گیا پھر اِک صدا سنا کے چلے

اپنے دم کا بھروسہ نہیں ٹھہر جاؤ
چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے

(۱۱۸) اولاد

دولت کوئی دُنیا میں پسر سے نہیں بہتر
راحت کوئی آرام جگر سے نہیں بہتر

لذت کوئی پاکیزہ ثمر سے نہیں بہتر
نکہت کوئی بوئے گلِ تر سے نہیں بہتر

صدموں میں علاجِ دلِ مجروح یہی ہے
ریحاں ہے یہی راح یہی روح یہی ہے

ماں باپ کا دل غنچۂ خنداں ہے اسی سے
سب راحت و آرام کا ساماں ہے اسی سے
گل ہے یہ کہ گھر رشکِ گلستاں ہے اسی سے
آبادیِ کاشانۂ انساں ہے اسی سے

کس طرح کھلے دل کہ جگر بند نہیں ہے
گھر قبر سے بدتر ہے جو فرزند نہیں ہے

یہ ہے وہ عصا پیر جواں رہتا ہے جس سے
وہ شمع ہے پُرنور مکاں رہتا ہے جس سے
یہ ہے وہ نگیں نام و نشاں رہتا ہے جس سے
وہ ڈور ہے قوی رشتۂ جاں رہتا ہے جس سے

کھوتے نہیں یہ مال زر و مال کے بدلے
موتی بھی لُٹا دیتے ہیں اس لال کے بدلے

دولت یہی شوکت یہی اجلال یہی ہے
سرمایہ یہی نقد یہی مال یہی ہے
ثروت یہی حشمت یہی اقبال یہی ہے
گوہر یہی یاقوت یہی لال یہی ہے

دل غنچہ ہے پہلو میں تو غم پاس نہیں ہے
کچھ پاس نہیں گر یہ رقم پاس نہیں ہے

ماں باپ کی آسائش و راحت ہے پسر سے
خوں جسم میں آنکھوں میں بصارت ہے پسر سے
تلخی میں بھی جینے کی حلاوت ہے پسر سے
ایامِ ضعیفی میں بھی طاقت ہے پسر سے

آرام جگر قوت دل راحت جاں ہے
پیری میں یہ طاقت ہے کہ فرزند جواں ہے

وہ شے ہے جو نشہ دریہ کھڑی رہتی ہے جس سے
وہ لال ہے ابد تک پڑی رہتی ہے جس سے

وہ چیز ہے راحت کی گھڑی رہتی ہے جس سے
وہ نور ہے یہ نور جاں لڑی رہتی ہے جس سے

آرام جگر تاب و تواں ساتھ ہے اس کے
پھرتا ہے جا بجا رشتۂ جاں ساتھ ہے اس کے

سلام (۱۱۹)

مرا راز دل آشکارا نہیں
وہ دریا ہوں جس کا کنارا نہیں

وہ گل ہوں جدا سب سے ہے جس کا رنگ
وہ بو ہوں کہ جو آشکارا نہیں

وہ پانی ہوں شیریں نہیں جس میں شور
وہ آتش ہوں جس میں شرارا نہیں

بہت نونہال دنیا نے دیں بازیاں
میں نوجواں ہوں کہ ہارا نہیں

فقیروں کی مجلس ہے سب سے جدا
امیروں کا یاں تک گزارا نہیں

سکندر کی خاطر بھی ہے سد باب
جو دارا بھی ہو تو مدارا نہیں

گئے ہیں پہنے نعلین واں مصطفیٰ
فرشتے کا جس جا گزارا نہیں

جہنم سے ہم بے قراروں کو کیا
جو آتش پہ ٹھہرے وہ پارا نہیں

پھرے دوست جب آ گئی قبر تک
کھلا اب کہ کوئی ہمارا نہیں

گرتے ڈگمگا کر زمیں پہ حسین
تہ سے صبر کے ہیں فدا یا حسین

غرض سے کسی نے اتارا نہیں
چھری کے تلے دم بھی مارا نہیں

کسی نے تنوی طرح سے اے انیسؔ
عروسِ سخن کو سنوارا نہیں

(۳۹) قلق سنہ ۱۸۸ء

خواجہ ارشد علی خاں بن خواجہ بہادر حسین فراق لکھنوی آپ خواجہ وزیر لکھنوی کے خواہر زادہ تھے۔ اور شعر گوئی میں انھیں سے تلمذ حاصل تھا اودھ کے آخری تاجدار واجد علی شاہ کے مصاحبین میں تھے جب ولی عہد کی شادی ہوئی تو انھیں خلعت دیا گیا مگر دربار شاہی سے خطاب عطا نہ ہوا خلعت کو زیب تن کرتے ہوئے فوراً یہ شعر پڑھا۔

خلعت و زر سے تو سب کچھ ہیں شادا جاؤں
ایسی شادی میں قلقؔ کہہ کے پکارا جاؤں

بادشاہ نے اسی وقت ان کو آفتاب الدولہ کا خطاب عطا فرمایا اور دیگر مقربین سے زیادہ مرتبہ بلند کیا سنہ ۱۸۵۷ء میں زندہ تھے اس کے چند سال کے بعد سنہ ۱۸۸ء کے قریب انتقال ہوا۔ دیوان موجود نہیں ایک مثنوی "طلسم الفت" چھوڑی۔ اس میں عشق و محبت کی جیتی جاگتی تصویریں کھائی گئی ہیں جس کا ڈراما ہندوستان کی مشہور تھیٹریکل کمپنیاں اپنے

اپنے اسٹیج پر نہایت شوق سے کھیلتی ہیں۔ یورپ کے ڈراموں کا بہت اچھا حصّہ وہ سمجھا جاتا ہے جس میں کوئی ایکٹر تنہائی میں اپنے دل ہی آپ باتیں کرتے ہوئے دلی خیالات کا اظہار کرتا ہے جس کی مثال شکسپیر کے مشہور پلے ہیملٹ سے ملتی ہے "مثنوی طلسم اُلفت" میں بھی اس قسم کا سین نہایت بے مثل طریقے سے لکھا گیا ہے چنانچہ ہم نے اپنے انتخاب مثنوی میں اسی سین کو لیا ہے جہاں عالم آرا حالتِ انتظار میں اپنے دل سے باتیں کر رہی ہے جو حسبِ ذیل ہے:-

(۱۲۰) مثنوی

حسرتِ دید بڑھتی جاتی ہے
متحمل جو ہو نہ سکتی تھی
ہم کو جانی بہت نہ ترساؤ
دل بہت بے قرار ہے اب تو
جو جو گزرے گی سب سہو لگی میں
مرضِ انتظار اے دلدار
گھڑی زندگی میں آجاتے
حسرتِ دید تو نہ رہ جاتی
ایک دن یہ کسی مصاحب نے

وحشتِ عشق سر اُٹھاتی ہے
آپ ہی آپ پہروں بکتی تھی
اس قدر راستہ نہ دکھلاؤ
آنکھوں میں جان آرہی ہے اب تو
گو تا تک منتظر رہوں گی میں
ہے کل امراض سے بڑا آزار
صورت اپنی ذرا دکھا جاتے
جو کہ کہنا تھا تم سے کہہ جاتی
باتوں باتوں میں کہہ دیا اُس سے

یہ کئی دن سے ہے خبر مشہور — کسی شہزادہ کا جہاز حضور
اس طرف کو کہیں سے آیا تھا — یاں تلک آنے بھی وہ نہ پایا تھا
کہ کچھ ایسی ہوا چلی ناساز — غرق اک دم میں ہو گیا وہ جہاز
سنتے ہی یہ سخن وہ کشتۂ غم — متوحش ہوئی کمال اس دم
بولی گھبرا کے سچ کہو اے خوش خو — کہیں میرا ہی وہ نگار نہ ہو
نام کیا اس قمر عذار کا تھا — رہنے والا وہ کس دیار کا تھا

(۱۲۱) غزل

ادا سے دیکھ لو جاتا رہے گلہ دل کا — بس اک نگاہ پہ ٹھہرا ہے فیصلہ دل کا
وہ ظلم کرتے ہیں ہم پر تو لوگ کہتے ہیں — خدا بروں سے نہ ڈالے معاملہ دل کا
خدا ہی خیر کرے رنگ آج بے ڈھب ہے — تپک رہا ہے کئی دن سے آبلہ دل کا
وہ رند ہوں کہ مجھے ہتکڑی ہی بیعت ہے — بلا ہے گیسوئے جاناں سے سلسلہ دل کا
بہار آتے ہی کنج قفس نصیب ہوا — ہزار حیف کہ نکلا نہ حوصلہ دل کا
خدا کے سامنے اپنا ہی اے قلق انصاف — بتوں سے حشر میں ہوگا معاملہ دل کا

(۴۰) اسیر ۱۸۸۱ء

تدبیر الدولہ مدبر الملک سید مظفر علی خاں ولد سید مدد علی قصبہ امیٹھی ضلع لکھنؤ کے

رہنے والے تھے عربی میں جملہ علوم و فنون کی کتابیں علماء فرنگی محل سے پڑھی تھیں شاعری میں شیخ غلام ہمدانی مصحفی امروہوی سے تلمذ تھا۔ نصیر الدین حیدر شاہ کے عہد حکومت میں لکھنؤ آئے تھے امجد علی شاہ کا زمانہ بھی دیکھا۔ پھر واجد علی شاہ کی مصاحبت میں کئی برس گزرے اور کلکتہ میں ان کے ساتھ رہے۔ بعد ازاں ریاست رام پور میں چلے آئے تھے پُر گو کہنہ مشق قادر الکلام شاعر تھے۔ آپ کی غزلیات میں اخلاقی مضامین زیادہ ہیں چھ دیوان چھوڑے آپ کا ایک فارسی دیوان بھی موجود ہے۔ علم عروض معانی و بیان سے کامل واقفیت تھی ۱۲۹۵ھ مطابق ۱۸۷۸ء میں بمقام رامپور انتقال کیا کلام یہ ہے:-

(۱۲۲) غزل

آہ کب لب پہ نہیں ہے داغ کب دل میں نہیں
کون سی شب ہے کہ گرمی اپنی محفل میں نہیں

ہجوم کی کثرت سے اندیشہ مرے دل میں نہیں
دل میں اُس کی ہے جگہ میرے جو محفل میں نہیں

پنجۂ مژگانِ تر نے یہ اُڑائیں دھجیاں
تار باقی ایک بھی دامانِ ساحل میں نہیں

خونِ ناحق کا ہمارے داغ چھٹنے کا نہیں
تیغ میں ہوگا اگر دامانِ قاتل میں نہیں

پردہ دار چہرۂ یوسف نہیں ہے ہر نقاب
حسنِ لیلیٰ جلوہ گر ہر ایک محمل میں نہیں

نجد کا صحرا عجب صحرائے وحشت خیز ہے
قیس کیا لیلیٰ کو بھی آرام منزل میں نہیں

جس طرف جی چاہے گا میرا نکل جاؤں گا میں
سیکڑوں دروازے ہیں حلقے سلاسل میں نہیں

بندھ گئی زلفِ سیاہِ یار کی ایسی ہوا
لاکھ شمعیں جل رہی ہیں نور محفل میں نہیں

جا سے باہر پاؤں جو رکھتا ہے ہوتا ہے خراب
گھر میں جو راحت مسافر کو ہے منزل میں نہیں

ڈوبے جاتے ہیں کیوں کچھ لوگ حیرت ہے مجھے
قطرہ آدم آب لجہ تیغِ قاتل میں نہیں

ہم غریبوں کا خدا ہی ناخدا درکار کیا
طالبِ ملاح کشتی دستِ سائل میں نہیں

ہو گیا دہشت سے ایسا بسملوں کا خون خشک
ایک بھی دھبّا لہو کا تیغِ قاتل میں نہیں

میرے زخموں کے لیے تیار ہو مرہم اسیر
اس قدر زنگار بھی شمشیر قاتل میں نہیں

(۱۴) منیر ۱۸۸۱ء

منیر۔ اسمٰعیل حسین خلف سید احمد حسین صاحب شاگرد میر رگو کا اصلی وطن شکوہ آباد ضلع مین پوری تھا لیکن ان کا قیام عرصہ دراز تک لکھنؤ میں رہا اور وہیں تعلیم و تربیت پائی تقریب ملازمت کانپور و فرخ آباد میں بھی رہے۔ آخر زمانہ میں نواب کلب علی خاں کے دربار سے منسلک ہو گئے تھے۔ رشک کے ارشد تلامذہ سے تھے۔ ناسخ سے بھی استفادہ سخن حاصل کیا تھا منیر آغاز شباب سے شاعری کے دلدادہ تھے۔ ان کے کلام میں قدیم تخیل اور الفاظ پرستی کا رنگ نمایاں ہے لیکن نہایت پرگو اور مشاق شاعر تھے۔ پیدائش ۹ ذی الحجہ ۱۲۳۴ھ مطابق ۱۸۱۹ء وفات ۱۲۹۸ھ مطابق ۱۸۸۱ء میں بمقام رامپور ہوئی۔ کلیات مطبوعہ ہے لیکن عام طور پر نہیں ملتی ان کی ایک مثنوی "معراج المضامین" کے نام سے زیادہ مشہور۔ کلام یہ ہے:۔

(۱۳۳) غزل

آمد تصور بت بیدادگر کی ہے — دل کی بھی لوٹ خانہ خرابی جگر کی ہے
نزدیک صبح رخصت اہل نظر کی ہے — اب حسن یار چاندنی پچھلے پہر کی ہے
دنیا میں مثل کاغذ آتش زدہ ہیں لوگ — مہلت شرار آنکھ کو اک اک نظر کی ہے

پیری ہی صبح شام جوانی کے واسطے
چاروں طرف کو اٹھتے ہیں ہوش اہلِ عقل کے
آنکھیں بچھی ہیں جال کے رستہ میں دور تک
تقدیر کی کجی ہو کہ ٹیڑھا ہو آسماں
اک بار تیر مار کے ایسے تک خبر نہ لی
آبادوں کی خانہ خرابی سے ہوچکے
گو رحم و راہ خنجر ابرو نے قطع کی
یہ رنگ و بو کہاں گلِ تر کو نصیب تھا
باقی ہی دل میں نوکِ مژہ کی ابھی کھٹک
اطفالِ اشک تنگ ہیں کھل کھیلیں کس طرح
دلی بگڑ کے بن گئیں اکثر ولایتیں
فرمانِ حسن گو رحم کے تابع ہیں نرم دل
نا مسلوک سے ہیں اگر کان آشنا
کر بیٹھیں ترکِ عشق سراپائے یار ہم
رخصت طلب ہی عاشقوں سے حسنِ یار کا
آوارہ چھوڑ جاتی ہی جسم گلی کو روح
مانند اختلاط کی سہل اب کی شاعری

مہمان شمعِ حسنِ بتاں رات بھر کی ہی
یارب ہوا دیارِ جنوں میں کدھر کی ہی
آمادہ قفس کی سمت یہ کس مشت پر کی ہی
یہ سب عنایت آپ کی ترچھی نظر کی ہی
یارب نگاہِ مست یہ کس بیخبر کی ہی
بستی زمانے میں ابھی ویران گھر کی ہی
پر تھوڑی سی لگاوٹ ابھی تک نظر کی ہی
اترا ہوئی قبا کبھی رشکِ قمر کی ہی
یہ بھی الس یادگار کسی نیشتر کی ہی
اے آستین تجھ میں جگہ ہاتھ بھر کی ہی
جس گھر میں دیکھو لوٹ اسی اجڑے گھر کی ہی
پینہ جہاں کہیں ہی رعیت شمر کی ہی
آوازِ خضرِ راہ ہر اک جانور کی ہی
مجبور ہیں کہ بیچ میں جا ہٹ کمر کی ہی
پروانوں سے وداع چراغِ سحر کی ہی
مٹی خراب گرد و غبارِ سفر کی ہی
تیزی نہ طبع کی ہی نہ وقعت نظر کی ہی

کہتا یہ ہے کہ مرتے ہیں تم پر نثار ہیں
جو عاشقانہ شعر ہے ہر گز ہے حسن سے
خالی ہے حسن بنایش و مضموں سے یک قلم
مرغوب ہے محاورہ ارباب شوق کا
موتی کے مول قطرہ بے مایہ بکتے ہیں
پھر بھی کبھی نگاہ کرم ہو گی اس طرف

تلخی نہ زہر کی۔ نہ حلاوت شکر کی ہے
پڑ دورہ جو غزل ہے وہ دشمن اثر کی ہے
ہر ایک بیت کوٹھڑی مفلس کے گھر کی ہے
ہاں گرس میں جنس کمال و ہنر کی ہے
ہٹی خراب آجکل آب گہر کی ہے
امید آج تک ابھی پہلی نظر کی ہے

بزم سخن میں لطف جناب عروج سے
شہرت منیر اس غزل مختصر کی ہے

(۱۲۴)

وہ ہنر یک خون جگر سے خوش دل زار موج خطر سے خوش
کوئی ہیرے دیدۂ تر سے خوش ہیں کسی کی تر چھی نظر سے خوش
نہ تو سینۂ آسحر سے خوش۔ نہ فلک کی بیا بھی نظر سے خوش
مرے کان تیری خبر سے خوش مری آنکھ حلقۂ در سے خوش
تری بو نہ لائی ادھر کبھی۔ مرے دل کی لی نہ خبر کبھی
صفت چراغ سحر کبھی۔ نہ ہوا نسیم سحر سے خوش
تہ رہ شرح کی ہو طلب جہاں وہیں اے فلک ہو گہر فشاں
کوئی طفل طبع نہیں یہاں جو ہو سیر رقص شرر سے خوش

نہ پھنسائے گیسوئے حور اُسے نہ ہنسائے صبح سرور اُسے
نہ خوش آئے آتشِ طور اُسے جو ہو میرے دردِ جگر سے خوش

تہ زلف ہوش ہوئے ہرن کھلے تیری آنکھوں کے مکر و فن
شب تار میں ہوئے راہزن مرے قافلے کے سفر سے خوش

بھرے جاؤں تیری وفا کا دم ہو اگرچہ سر بھی مرا قلم
نہ فراقِ جان و بدن کا غم نہ وصالِ گردن و سر سے خوش

کبھی تھے یہ کوچۂ یار میں کبھی دل کے جیب و کنار میں
مرے اشک فصلِ بہار میں نہیں دامنِ گلِ تر سے خوش

فقط آبرو ہی نہ مجھ کو دو نگہ غضب سے بھی کام لو
جسے آبِ تیغ کی پیاس ہو وہ ہو کیوں مگر آبِ گہر سے خوش

کروں دم میں قطع رہِ سفر نہ ہو غم عدم میں بھی بال بھر
اُسی تیغ سے مجھے ذبح کر جو رہا ہو قربِ کمر سے خوش

جسے حکم یار کا پاس ہو یہی رمز فقر شناس ہو
وہ دل آنسوؤں سے اُداس ہو نہ حصولِ گنج گہر سے خوش

چھٹے دل سے سیر حیات کی کہ وداع تن سے ہو جان کی
نہ ہو لو بھی آپ کے کان کی خبرِ چراغ سحر سے خوش

مرے دل میں داغِ وفا ہے جو اُسے لالہ طرح کا رتبہ دو
نہ کیفِ کلیم سے شاد ہو نہ رہے جبینِ قمر سے خوش

سوئے زلف ہی نہ گزر کرے رگِ جاں میں بھی کبھی گھر کرے
وہی بل توجہ ادھر کرے جو ہو وصل موئے کمر سے خوش

یہ نہیں شبہ دل میں نہ ٹھانئے مرے ہونے کو مانئے
اگر آنکھ جھپکے تو جانئے کہ نہیں ہیں برقِ نظر سے خوش

نہیں مصیبت کی کچھ انتہا کوئی کار نیک تو ہو بھلا
کروں اہلِ شہر کو اے خدا میں ہوائے دامنِ تر سے خوش

تپِ سوزِ غم کے مریض کو مئے ناب سے نہ سرور ہو
جلے اپنی آگ میں آپ جو وہ ہو کیونکر آتشِ تر سے خوش

مرے دل کی دیکھ کے بے بسی ہو شریکِ عالمِ بے بسی
لبِ گور تک رہے وہ ہنسی جو ہو دل کے زخمِ جگر سے خوش

کروں عید شانِ شرع کی جو دکھائیں شکل وہ چاند سی
رہیں آنکھیں خوابِ فنا میں بھی دمِ آخری کی نظر سے خوش

یہی زلف میں ہے اسیر بھی یہی یا تیرے در کا فقیر بھی
دلِ بے قرار منیر بھی ہو کبھی کرم کی نظر سے خوش

(۴۲) رخشاں ۱۸۸۳ء

نواب ضیاء الدین خان خلف فخر الدولہ احمد بخش خان بہادر دہلوی فارسی میں نیّر اور اردو میں رخشاں تخلص تھا۔ مرزا غالب سے قرابت کے علاوہ تلمذ کی نسبت بھی تھی۔ دہلی کے اہل کمال میں آپ کا دم غنیمت تھا۔ صرف شاعر ہی نہ تھے بلکہ شعر کے نقاد بھی۔ عامیانہ خیالات اور ٹکسال باہر محاورات کو اپنے کلام سے دور رکھتے تھے۔ علم تاریخ کے ماہر تھے اور گزشتہ واقعات سے جو تاریخ مرتب کرتے تھے وہ نہایت گراں مایہ اور قابل قدر ہوتے تھے۔ نواب صاحب نے ۱۳۰۱ھ مطابق ۱۸۸۳ء میں انتقال فرمایا۔ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کی درگاہ میں دفن ہوئے۔ نمونہ کلام یہ ہے:-

غزل (۱۲۵)

پی کے گرنے کا ہے خیال ہمیں	ساقیا بھیجو سنبھال ہمیں
شب نہ آئے جو اپنے وعدے پر	گزرے کیا کیا نہ احتمال ہمیں
تیرے غصے نے ایک دم میں کیا	خردہ دل صد ہزار سال ہمیں
دل میں مضمر ہو معنیٔ باقی	کسی صورت نہیں زوال ہمیں

طالع یار سے نیّر رخشاں
اپنے ہی گھر میں ہو وصال ہمیں

(۳۴) قدرؔ ۱۸۸۳ء

مولوی غلام حسین بلگرامی ولد میر خلعت علی۔ ان کا سلسلۂ نسب حضرت زید شہید بن امام زین العابدین سے ملتا ہے۔ بلگرام کے باشندے تھے ۱۲۴۹ھ مطابق ۱۸۳۳ء میں پیدا ہوئے۔ واجد علی شاہ کے عہد میں لکھنؤ تشریف لائے اور وہاں علوم عربیہ حاصل کئے شاعری میں پہلے آپ سحر و برق سے اصلاح لیتے رہے ان دونوں کی وفات کے بعد شیخ امداد علی بحر ارشد تلامذہ حضرت ناسخ کے شاگرد ہوئے غدر ۱۸۵۷ء کے بعد حضرت قدر لکھنؤ سے دہلی چلے آئے اور مرزا غالب مرحوم سے استفادہ اُٹھایا آخر میں سرکار آصفیہ میں ملازم ہو گئے تھے صنائع بدائع و عروض سے بخوبی واقف تھے۔ پنگل یعنی ہندی کا عروض جانتے تھے ندائے العروض اور اعجاز خسروی کا حاشیہ آپ کا لکھا ہوا موجود ہے۔ ۲۳ ذی قعدہ ۱۳۰۱ھ مطابق ۱۸۸۳ء کو لکھنؤ میں انتقال کیا۔ کلیات شائع ہو چکی ہے۔ کلام کا انتخاب یہ ہے:-

(۱۱۶) غزل

خدا کو مانو ہنسی نہ جانو نہ میرے دل پہ جفا کرو تم
ملے گا عرش بریں کا پایہ ذرا تو خوف خدا کرو تم

زمانہ الٹا ہی کیا کرو تم جدا جو ہی ہو وہ ادا کرو تم
دغا کریں ہم جفا کرو تم دعا کریں ہم دغا کرو تم

سرورِ وصلت کہ رنجِ فرقت دوائے الفت کہ دردِ کلفت
نشانِ بوسہ کہ داغِ حسرت قبول ہے جو عطا کرو تم

ہمیں نے پہلے گلا کٹایا ہمیں نے قاتل تمہیں بنایا
ہمیں نے یہ رنگ سب جمایا ہمارے حق میں دعا کرو تم

ابھی کفن مردے پھاڑ ڈالیں ابھی ہزاروں کو سر نکالیں
ابھی جو محشر کی چل کے چالیں ذرا قیامت بپا کرو تم

دل و جگر پلکوں پہ کھنچا ورنہ تو جان قربان ہے لبوں تک
اب ایک سر ہے اسے بھی لیکر قدم پہ اپنے فدا کرو تم

نباہ ہوگا اسی میں باہم رہے یہ دونوں طرف کا عالم
کہ بے تکلف نہ تم سے کچھ ہم نہ ہم سے شرم و حیا کرو تم

ہزار دل ہوں جو اے جفاجو دریغ تم سے نہیں ہے ہرگز
اسیر گیسو قتیلِ ابرو شہید ناز و ادا کرو تم

لگا ہے دل ہم سے خیر بہتر رہیں جو اغیار بھی مکدر
ذرا نہیں اختیار جس پر پھر اس کے بارے میں کیا کرو تم

ہماری شہ رگ پھڑک رہی ہے کہ روح اس میں اٹک رہی ہے
تمام گردن لٹک رہی ہے ابھی نہ خنجر جدا کرو تم

ہوئیں جگت آشنا نگاہیں۔ ہیں کفر و اسلام سب رہا ہیں
ملو تم اس سے وہ جس کو چاہیں۔ نئے نئے آشنا کرو تم
ہمارے نالوں کو سن جو پاؤ یقیں ہے غش کھا کے لوٹ جاؤ
نہ لوٹ جاؤ نہ غش میں آؤ تو دفعتہً واہ واہ کرو تم
بہت نہ جھکتے ہٹتے رہو تم بھیسے ہو اب جو پڑے سہو تم
جو بوسہ لوں تو کیا کہو تم گلے لگا لوں تو کیا کرو تم
بجا ہے بیجا مرا لگانا تھا۔ تمہارا اس میں گناہ کیا تھا
یہ میری تقدیر میں لکھا تھا نہ مجھ پہ جور و جفا کرو تم

بتاؤ ای قادر کیا کہا تھا یہ ہی نتیجہ ہے عاشقی کا
غریب و بیکس ذلیل و رسوا خراب خستہ پھرا کرو تم

(۴۴) نواب ۱۸۸۷ء

نواب کلب علی خاں آشیاں والی رام پور۔ نواب یوسف علی خاں کے صاحبزادے تھے شاعری میں منشی امیر احمد صاحب امیر مینائی لکھنوی کے شاگرد تھے۔ معقول و منقول کی کتابیں مولانا فضل حق صاحب خیر آبادی سے پڑھی تھیں۔ آپ کے عہد میں رام پور مشرقی علوم و فنون کا مرکز بنا ہوا تھا۔ ہر فن کے کامل موجود رہتے تھے۔ اردو و فارسی دیوان چھوڑے۔ نہایت علم دوست اور شریف نواب تھے۔ تاریخ ولادت ۲۰ ذی الحجہ ۱۲۵۰ھ مطابق ۱۹ اپریل ۱۸۳۵ء وفات

۲۷ر جمادی الآخر ۱۳۰۴ھ مطابق ۲۳ر مارچ ۱۸۸۷ء نمونہ کلام یہ ہے:-

ہلے کیونکر نہ تیری رہ گزر کی ہر زمیں برسوں
کہ نالوں سے مرے کانپا کیا عرشِ بریں برسوں
بھلا کیا خاک سوئے چین سے وہ کنجِ مرقد میں
رہا ہو جس کے سر کا تکیہ دوشِ نازنیں برسوں
تری صورت کا نقشہ جب کبھی کھنچ جائے گا پورا
تو صنعت پر کرے گا ناز صورت آفریں برسوں
عجب حسرت سے دیکھا سوئے جاناں دمِ آخر
رہے گی یاد اس کو بھی نگاہِ واپسیں برسوں
اڑائیں دھجیاں ہاتھوں نے اس کی جوشِ وحشت سے
رہی تھی دیدۂ خونبار پر جو آستیں برسوں
کیا عشقِ کمر نے بے نشاں ایسا نہ پائیں گے
عدم میں بھی اگر ڈھونڈیں گے مجھ کو ہم نشیں برسوں
رفاقت لذتِ زخمِ جگر تیری ہی جب جانوں
کہ مرقد میں بھی میرے منہ سے نکلے آفریں برسوں

ہوئے ہوں گے کسی سے وصل کے اقرار بھی شاید
رہی ہے تو اُس بے رحم کافر کی نہیں برسوں

نصیبوں میں جو لکھی ہو بُرائی وہ نہ جائے گی
اگر رگڑوں گا در پر کعبہ کے نقشِ جبیں برسوں

اسیر دامِ گیسو دل ہوا تو یوں بھی وحشت ہو
نہ چھوڑوں گا کبھی ہاتھوں سے زلفِ عنبریں برسوں

اسی اُمید پر شاید کسی دن آؤ تم یاں ہو
نہ جائیں گے تمہارے در سے دم بھر کو کہیں برسوں

جفا سے اس کی ٹھہرے گا نہ اے نواب کوئی بھی
رہیں گے دیکھ لینا کوئے جاناں میں ہمیں برسوں

(۴۵) حیا ۱۸۸۶ء

شاہزادہ میرزا رحیم الدین خلف میرزا کریم الدین رسا نبیرہ شاہ عالم ثانی سنہ ۱۲۴۱ھ میں پیدا ہوئے شاعری میں حضرت شاہ نصیر اور ذوق سے تلمذ تھا۔ ذہین طباع اور نازک خیال شاعر تھے شطرنج کھیلنے میں مشہور تھے۔ ولایت سے جتنے شطرنج کے نقشے آتے تھے۔ ان کو حل کرنا آپ کا کام تھا۔ داغ و امیر کے ہمعصر تھے۔ نواب کلب علی خاں خُلد آشیاں والی رام پور کے مصاحبوں میں داخل تھے۔ سنہ ۱۳۰۴ھ مطابق ۱۸۸۶ء دُنیا سے رخصت

ہو گئے ۶۹ سال کی عمر پائی ان کا دیوان صاحبزادہ محبوب علی خان رامپوری نے چھپوایا تھا۔ کلام کا نمونہ یہ ہے:-

(۱۲۸) غزل

موت ہی چارہ ساز فرقت ہے — رنج مرنے کا مجھ کو راحت ہے

ہدفِ تیر لوحِ تربت ہے — بعد مردن بھی یہ عداوت ہے

ہو چکا وصل وقت رخصت ہے — اے اجل چل، آ کہ فرصت ہے

ناز کی داد کون دیوے گا — ظلم کرنا تمھاری عادت ہے

کاروانِ عمر کا ہے رخت بدوش — ہر نفس بانگِ کوسِ رحلت ہے

سانس اک پھانس سی کھٹکتی ہے — دم نکلتا نہیں مصیبت ہے

تم بھی اپنے حیا کو دیکھ آؤ
آج اس کی کچھ اور حالت ہے

(۴۶) اختر ۱۸۸۷ء

واجد علی شاہ (والی اودھ) آپ امجد علی شاہ کے خلف اکبر تھے ۱۸۴۷ء میں مسند نشین

ہوئے۔ آپ کی طبیعت نہایت عیش پسند واقع ہوئی تھی۔ فیاض بھی تھے ۱۸۵۶ء میں اودھ کی سلطنت کا انتظام گورنمنٹ انگریزی نے اپنے ہاتھ میں لے لیا اور آپ کو نظر بند کر کے کلکتہ بھیج دیا۔ ۱۲ لاکھ روپیہ سالانہ وظیفہ ملتا تھا۔ اس حالت میں بھی عیش و نشاط سے ہاتھ نہ اُٹھایا۔ گزشتہ فیاضی میں فرق نہ آنے دیا۔ ۲۱ محرم ۱۳۰۵ھ مطابق ۱۸۸۷ء میں وفات پائی۔ علماء و شعراء کے قدر داں تھے۔ شاعری میں جملہ اصناف سخن پر قادر تھے چھ دیوانوں کے علاوہ آپ کی مثنویاں قائل دیا ہیں جن میں اپنے کارناموں کو آزادانہ طریقہ سے کھلے ہوئے الفاظ میں قلمبند کیا ہے۔ فن موسیقی کے دلدادہ تھے نمونہ کلام یہ ہے:۔

غزل (۱۲۹)

چاک چاک اپنا گریباں نہ ہوا تھا سو ہوا ... وحشت دل کا جو ساماں نہ ہوا تھا سو ہوا

رخ ترا آتش سوزاں نہ ہوا تھا سو ہوا ... دل مرا شمع شبستاں نہ ہوا تھا سو ہوا

ابر مجھ پر کبھی گریاں نہ ہوا تھا سو ہوا ... گھر کبھی خانۂ زنداں نہ ہوا تھا سو ہوا

چمن عشق بیاباں نہ ہوا تھا سو ہوا ... زخم دل خوردۂ نمکداں نہ ہوا تھا سو ہوا

زرد رنگ رخ جاناں نہ ہوا تھا سو ہوا ... دل کبھی طفل دبستاں نہ ہوا تھا سو ہوا

یا خدا دیر میں ساماں نہ ہوا تھا سو ہوا ... کافر عشق مسلماں نہ ہوا تھا سو ہوا

جور چرخ گنبد گرداں نہ ہوا تھا سو ہوا ... دل کبھی گنج شہیداں نہ ہوا تھا سو ہوا

رخ انور سے میں حیراں نہ ہوا تھا سو ہوا ... کبھی اک زلف پریشاں نہ ہوا تھا سو ہوا

ظلم و جور اے شبِ ہجراں نہ ہوا تھا سو ہوا	خانۂ گور میں مہماں نہ ہوا تھا سو ہوا
	چشمِ انصاف سے طوفاں نہ ہوا تھا سو ہوا دلِ اختر چمنستاں نہ ہوا تھا سو ہوا

(۴۷) ادیب ۱۸۹۱ء

مولوی سیف الحق ولد مولوی احسان الحق دہلوی ۱۲۶۳ھ مطابق ۱۸۴۶ء میں پیدا ہوئے حضرت مولانا شاہ عبدالحق محدث دہلوی ان کے مورث اعلیٰ تھے عربی فارسی اور تھوڑی سی انگریزی جانتے تھے۔ فنِ سخن میں حضرت غالب کے شاگرد تھے شاعری کے علاوہ زبردست انشا پرداز تھے ۱۸۸۲ء میں بیوہ رگزنٹ دہلی کے ایڈیٹر ہوئے اس کے بعد لاہور پہنچکر ۱۸۸۴ء میں رفیق ہند کے جواب میں شفیق ہند جاری کیا۔ رفیق ہند اس زمانہ میں جمہور مسلمین اور ان کے مسلمہ لیڈروں کی پالیسی سے الگ ہوکر اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنائے ہوئے تھا اس کے ظرافت آمیز مضامین نے دھوم مچا رکھی تھی آخر زمانہ میں ریاست حیدرآباد سے تعلق ملازمت ہوگیا تھا۔ ہیں بعمر ۴۵ سال ۱۳۰۹ھ مطابق ۱۸۹۱ء میں انتقال ہوگیا کلام کے جمع کرنے پر توجہ نہ تھی۔ اس لئے کوئی دیوان موجود نہیں ہے۔ کلام کا انتخاب یہ ہے:۔

(۱۳۰) غزل

دولتِ اشک نظر آتا ہے تلاطم مجھ کو
جستجو خاک کی ہے بہرِ تیمم مجھ کو

خود پسندی نے مجھے ذرہ ہیں یکتا کیا
کیوں بری طرح سے آتے ہو نظر تم مجھ کو

بحرِ مواج میں قطرہ کا تماشا دیکھو
ناخدا چھوڑ چلا ہے بیچ قلزم مجھ کو

خوگرِ جور ہوں الطافِ محبت معلوم
میں نہیں غیر کہ ہو لطفِ ترحم مجھ کو

دل میں خاموشی کو اک حضرِ تعلق جانا
نہ بن آئی کوئی جب طرزِ تکلم مجھ کو

دل میں برداشت نہیں رشکِ عدو کا اے تو
آپ کا لطف گوارا نہ ترحم مجھ کو

کام بگڑے نظر آتے ہیں جب ہی ملک کے خدا
گوشِ دل دے اسے یار سے تکلم مجھ کو

موجِ دریا کی حقیقت بھی کھلی یارِ ادیب
جوشِ گریہ نے دکھایا جو تلاطم مجھ کو

(۸۴) صفا رسنہ ۱۸۹۳ء

صاحبزادہ محمد صفدر علی خان خلف نواب محمد سعید خان والیٔ رامپور آپ رامپور کے صاحبزادوں میں خوش گو۔ عالی فکر شاعر تھے۔ حضرت امیر مینائی کے شاگرد تھے طبیعت میں شوخی مضامین میں گرمی ہے۔ آپ کا دیوان مطبوعہ موجود ہے جو شاعری کی دنیا میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ زمانہ قبل جنرل اعظم الدین خاں ۱۸۹۱ء میں وارد کلکتہ تھے

اُس کے دو سال کے بعد وہیں انتقال ہوا۔ تاریخ انتقال ۲۲ جمادی الآخر ۱۳۱۰ھ مطابق ۱۶ جنوری ۱۸۹۳ء ہے۔ ۱۸ جنوری کو رام پور میں دفن ہوئے۔ کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو:-

(۱۳۱) غزل

تھا شکایت کا جو اُن سے حوصلہ جاتا رہا — سامنا جب ہو گیا سارا گلہ جاتا رہا
فصلِ گُل میں بیڑیاں کاٹیں عبث حدّاد نے — تھا جو سرِ کارِ جنوں سے سلسلہ جاتا رہا
وائے قسمت بے خودی میں کھو گئی تصویرِ یار — دل کے بہلانے کا یہ بھی مشغلہ جاتا رہا
اس قدر صدمے سہے ہم نے بتوں کے عشق میں — دل لگانے کا کسی سے حوصلہ جاتا رہا
جام ٹوٹے اپنے دورِ چرخِ مینا رنگ میں — محتسب کا شکوہ قاضی کا گلہ جاتا رہا
تھیں وہ ساری وحشتیں جوشِ جنوں تک اب کہاں — سر سے وہ سودا گیا دل سے ولولہ جاتا رہا
دوستوں کے ہاتھ سے صدمے اٹھائے اس قدر — دل سے اپنے دشمنوں کا بھی گلہ جاتا رہا

عہدِ پیری میں کہاں صفانہ جوانی کے سے رنگ
وہ بہار آخر ہوئی وہ ولولہ جاتا رہا

(۴۹) عزیز ۱۸۹۳ء

نواب حافظ عبد العزیز خاں بریلوی خلف نواب سعادت یار خاں آپ حافظ الملک

حافظ رحمت خاں کے پوتوں میں تھے عربی فارسی میں مشرقی علوم کی تکمیل کی تھی سنسکرت بھی جانتے تھے ضلع بریلی کی عدالت میں وکالت کرتے تھے۔ آپ کی ایک کتاب مجالس العلوم کے نام سے شہرت پذیر ہے جس میں تمام علوم و فنون کا بیان ہے۔ دیوان فارسی و اُردو ۱۸۹۲ء میں چھپ چکا ہے ۵ برس ۸ ماہ کی عمر پاکر ۱۳۰۹ھ مطابق ۱۸۹۱ء میں انتقال کیا۔ نمونہ کلام یہ ہے:-

غزل (۱۳۲)

یا خدا دل میں غمِ یار کی مہمانی ہے
شرم رکھ لے کہ بہت بے سروسامانی ہے

عشق کا بھید چھپانے کو بنا ہوں مجنوں
پردۂ رازِ محبت مری عریانی ہے

اشکِ گلنار کی ہے عشق کے بازار میں قدر
قیمتی ہے وہی یاقوت جو رمانی ہے

راستے اور بھی ہیں ملکِ عدم کے لیکن
تیغ کے گھاٹ اتر جانے میں آسانی ہے

نقدِ جاں ہو دلِ مجروح میں کیونکر محفوظ
زخم کے چھید سے دشوار نگہبانی ہے

عشق سینے میں نہاں سوز تو آنکھوں میں سرشک
طرفہ تر ہے کہ کہیں آگ کہیں پانی ہے

لائے ہو یہ ہمی طبعِ ازل سے ہمراہ
چین ماتھے کی تمہارا خطِ پیشانی ہے

صدمہ پہونچا تپشِ دل سے تنِ نازک کو
وصل کی نیت مجھے یہ ان سے پشیمانی ہے

خرمنِ غنچۂ گل سینۂ بلبل ہے عزیز
کثرتِ زخم ہے چھالوں کی فراوانی ہے

(۵۰) فروغ سنہ ۱۸۹۳ع

شاہزادہ میرزا قیصر بخت دہلوی خلف میرزا آغا بخش صاحب۔ میرزا جوان بخت کے زمانہ سے دہلی کو چھوڑ دیا تھا اور بنارس میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ ہمیشہ مومن و غالب و ذوق کے مشاعروں میں شریک رہتے تھے۔ شاعری میں اپنے والد کے شاگرد تھے مگر امام بخش صہبائی اور عبدالرحمن خاں صاحب احسان کو بھی اپنا کلام دکھاتے رہتے تھے۔ نہایت پر مضمون اور معنی خیز اشعار کہتے تھے صاحب دیوان تھے سنہ ۱۳۱۱ھ مطابق سنہ ۱۸۹۳ع کے قریب انتقال ہوا۔ نمونہ کلام یہ ہے:۔

(۱۴۳) غزل

بڑھ گئی یاں مرے گرمیٔ وحشت میری
مثل سیماب گڑھوں اڑتی ہے تربت میری

آپ کا عشق بھی کیا قفل زباں بندی ہے
نہیں کھلتی جو زباں بہر شکایت میری

عکس آئینۂ دل میں ہے ترے قامت کا
میرے پہلو میں ہے موجود قیامت میری

عرشِ اعظم پہ زمیں کا سرِ عزت پہنچا
اس قدر بڑھ گئی عالم میں کدورت میری

مجھ کو بجز جامۂ وحشت کوئی جامہ نہ ملا
چشم آہو کی سیاہی ہوئی قسمت میری

ہے فروغ اپنا کلام آئینۂ غیب نما
کہ نظر آتی ہے اشعار میں فکرت میری

(۵۱) مذاق سنہ ۱۸۹۴ء

مولوی دلدار علی شاہ بدایونی ان کا نام شیخ دلدار علی صدیقی ۲۰ ربیع الاول سنہ ۱۲۳۴ھ مطابق سنہ ۱۸۱۹ء کو بدایوں میں پیدا ہوئے خاقانی ہند ذوق دہلوی کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ زانوئے شاگردی تہہ کرتے وقت فی البدیہہ یہ قطعہ کہہ کر استاد کو سنایا تھا:-

کیا کرے دل عرضِ اشتیاق اپنا
شعر کہنا غرض تھا مذاق اپنا

ذوق تھا بہرِ تلمذ کا
کہ تخلص کیا مذاق اپنا

۱۱ ربیع الثانی سنہ ۱۳۱۲ھ مطابق سنہ ۱۸۹۴ء کو بدایوں میں انتقال ہوا انتقال سے ۲۰ سال قبل عاشقانہ شعر کہنا چھوڑ دیا تھا صرف نعت و منقبت لکھا کرتے تھے اور ذکر و شغل میں مشائخانہ زندگی بسر کرتے تھے کبھی اپنا دیوان مرتب کرنے کی طرف توجہ نہیں کی زمانہ شباب کے عاشقانہ کلام کا بڑا حصہ ضائع ہو گیا۔ انتقال کے بعد بعض شاگردوں نے آپ کے کلام کا ایک مجموعہ مرتب کیا جس میں ہر قسم کا کلام حمد و نعتیہ سہرا کا داخل ہے کتاب کلام دلدار علی مذاق کے نام سے بدایوں میں طبع ہوئی ہے نمونہ کلام درج ذیل ہے:-

(۱۳۴) غزل

جو گرم ہو حسن آتش جبیں کا ۔ نہ رہے پری کا نہ حور عین کا
نقاب اُٹھ جائے آتشیں کا تو چاند جل جائے چودھویں کا

قلم کو زہرہ نہیں رقم کا۔ ہے دل میں دفتر بھرا الم کا
ورق ہے جو اس کتابِ غم کا۔ وہ ایک دیوان ہے حزیں کا

تلاش دیر و حرم ہے بیجا۔ کہ جا بجا ہے وہ جلوہ فرما
جہاں پہ ڈھونڈا وہیں پہ پایا۔ ہر اک مکاں ہے اسی مکیں کا

ہوا جو طفلِ سرشک پیدا۔ بنا وہ جلوے میں رشکِ موتی
کہا تھا کچھ ہم نے وقت گریہ۔ خیال اُس چشمِ سرمگیں کا

مذاق کہدے یہ نکتہ داں سے۔ ثریا ہم نے لامکاں سے
کیا تھا ناسخ نے آسماں سے۔ بلند رتبہ مگر اُس زمیں کا

(۵۷۱) فطرت سنہ ۱۸۹۴ء

سید حامد علی گورکھپور کے رہنے والے تھے۔ ایشیائی شاعری میں مغربی روح پھونکنا چاہتے تھے مختلف عنوانوں پر نظمیں لکھتے تھے۔ ۴۰ سال کی عمر میں سنہ ۱۳۱۲ھ مطابق سنہ ۱۸۹۴ء کے قریب انتقال ہو گیا۔ نمونۂ کلام یہ ہے:-

(۱۳۵) جلوۂ بیگانہ

جلوہ تیرا راہِ فنا میں ۔ شوخی تیری چشمِ قضا میں
قوت تیری دستِ دعا میں ۔ ٹھنڈک تیری بادِ صبا میں

رنگت تیری برگِ حنا ہیں
عصمت تیری چشمِ حیا ہیں

اے تو اور کرشمہ تیرا
پردۂ حاجت پردہ تیرا

ہر اک دل میں جلوہ تیرا
بزمِ تصور کمرہ تیرا

صورت پیاری نام خدا ہے
رنگ ترا لا ڈھنگ نیا ہے

تو ہو ساقی بادۂ عرفاں
غمزے تیرے فتنۂ دوراں

بستی تیری شہر خموشاں
پرتو تیرے سارے خوباں

چشم ہوس سے خلوت تیری
سب سے اوجھل صورت تیری

بزم میں تیری ہو کا عالم
شاخِ تکلم دستِ ماتم

محفل تیری چشمِ پرنم
عاشق تیرے نالاں پُرغم

لطفِ محبت جس نے پایا
جی بھر کر کچھ لطف اُٹھایا

ہستی تیری چشم ادا ہیں
آہٹ تیری بانگِ درا ہیں

ہستی تیری رنگ فنا ہیں
قایم تجھ سے جان حیا ہیں

ہر اک رنگ میں تو ہی تو ہے
باغ جہاں میں تیری بو ہے

یہ رونق ہے بزم وحدت
لکھے تیرے رمز حقیقت

ہے آبادی تجھی سے جنت
کس کی روح میں اتنی قدرت

یہ ہمہ ایسی باتیں فطرت
کچھ تو سوچ اپنی حقیقت

(۵۳) بیان [illegible]

سید مرتضیٰ میرٹھ کے سادات عظام سے تھے۔ نازک مزاج ایسے تھے کہ چاند سورج کی روشنی برداشت نہ کر سکتے تھے چودہ برس کی عمر سے آخر وقت تک گوشۂ تنہائی میں گزار دی۔ زبان دہلی کے مقلد مگر اجتہاد کا پہلو لئے ہوئے تھے اپنے ہمعصروں میں سے کسی کو کم خیال میں لاتے اور تھے بڑے مضمون آفریں۔ قدرت نے جدت طرازی کا مادہ ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ ان کی تصنیفات میں چھوٹا سا مجموعہ نعتیہ اور کچھ کلام عاشقانہ ہے انیا ئی شاعری کی الوداع" ان کا ایک مسدس مشہور ہے ۷۶ سال کی عمر پا کر ۱۳۱۸ھ مطابق ۱۹۰۰ء میں دار فانی سے سدھار گئے۔

نمونہ کلام حسب ذیل ہے

(۱۳۶)

ایڈیٹر سے خطاب

کلیسا میں بُت کی ادا بن گئی تو
حرم میں پہونچ کر خدا بن گئی تو

یہ پردے کی ہے بات سن لے نہ کوئی
کہ پردے میں کیا جانے کیا بن گئی تو

لگائی ہے تو تجھ سے اکھڑے ہوؤں نے
اندھیرے گھروں کا دیا بن گئی تو

ہر اک رنج و غم کو کیا محو تو نے
ہر اک درد دکھ کی دوا بن گئی تو

بیاں کے سوا تو نے سب سے نبھائی
یہیں آکے بس بے وفا بن گئی تو

انتخاب از "ایشیائی شاعری کی الوداع"

(۱۳۷) رُخصتِ عُروس

سلاطین کا تابع رہا ہے زمانہ
ہوا جس طرف ان کا توسن روانہ

اُسے طابق النعل بالنعل جانا
نئی چال چلتا رہا ہے پرانا

اگر کاخِ دولت کی نوبت نئی ہو
نوبت کا ڈنکا نیا گت نئی ہو

شہانِ سلف کی یگانو کہاں ہے
جہاں کو قرار ایک پہلو کہاں ہے
وہ دِلّی کہاں ہے وہ اُردو کہاں ہے
خدا کی مشیت پہ قابو کہاں ہے

مٹے کاغذی ناؤ کے کھینے والے
گئے مُفت کی روٹیاں دینے والے

رہو گے ذُل میں گرفتار کب تک
نہ عقبےٰ سے ہوگا سروکار کب تک
گھسیٹو گے تسبیح و زُنّار کب تک
رہے گی یہ دُنیائے غدّار کب تک

جھکو جانبِ کعبہ چھوڑو بتوں کو
نہ پتھر سمجھیں گے توڑو بتوں کو

مسافر ہے انسان بحرِ فنا کا
خطر ہے سفینوں کو موجِ بلا کا
سفر چاہیئے دیکھ کر رُخ ہوا کا
کہا مان لو منتظم کے ناخُدا کا

نہ کشتی سے گرداب میں گر پڑو تم
مُعلّم جدھر پھیر دے پھر پڑو تم

(۵۴) امیر سنہ ۱۹۰۰ء

منشی امیر احمد مینائی۔ ولادت ۱۶ شعبان سنہ ۱۲۴۴ھ بعہد شاہ نصیر الدین حیدر بمقام لکھنؤ۔ وفات ۱۹ جمادی الآخر سنہ ۱۳۱۸ھ مطابق ۱۳ اکتوبر سنہ ۱۹۰۰ء بمقام

حیدرآباد دکن۔ تدبیرالدولہ مدبرالملک منشی سید منظفر علی خاں امیر لکھنوی کے قابلِ فخر شاگرد ہیں اور بعد وفات اُستاد کے شعرائے لکھنؤ میں بجائے خود اُستاد اور یادگار سلف مانے جاتے تھے۔ اُن کی اور جلال کی وفات نے لکھنؤ کے معمر کہن مشق شعرا کا خاتمہ کر دیا۔ امیر مینائی کی معلومات بڑی حد تک کافی و وافی تھی۔ زبان اُردو کی یہ بدقسمتی تھی کہ امیر اللغات کا پورا مواد جمع تھا مگر صرف الف ممدودہ مقصورہ کی دو جلدیں چھپنے پائی تھیں کہ آپ نے وفات پائی اور اب امیر کا ہمسر اور اُس پایہ کا محقق کوئی نظر نہیں آتا۔ اُن کے شاگرد سیکڑوں کی تعداد میں موجود ہیں۔ ایک دیوان نعتیہ اور دو دیوان عاشقانہ ایک مثنوی صبحِ ازل اور ایک شامِ ابد۔ تذکرہ انتخاب یادگار اور متعدد مُسدس وغیرہ اُن سے یادگار ہیں

نمونہ کلام یہ ہے

غزل (۱۳۸)

ضبط کرتا دلِ حزیں نہ کہیں
چوٹ لگ جائے گی کہیں نہ کہیں

مسکرا کر وہ شوخ کہتا ہے
آج بجلی گری کہیں نہ کہیں

دل میں باتیں بھری تھیں کیا کیا کچھ
ہائے کچھ وقت پہ ایسیں نہ کہیں

نہ تڑپ اس قدر دلِ بیتاب
سہم جائے وہ نازنیں نہ کہیں

آگ ہو جائے گا وہ شوخ امیر
کھینچنا آہِ آتشیں نہ کہیں

(۱۳۹)

گزشتہ خاک نشینوں کی یادگار ہوں میں
مٹا ہوا نشانِ سرِ مزار ہوں میں

پھر اُس کی شانِ کریمی کے حوصلے دیکھے
گناہ گار یہ کہہ دے گناہ گار ہوں میں

پڑا ہو دستِ اجل مجھ پہ لاکھ بار مگر
نکل گیا ہوں تڑپ کر وہ بیقرار ہوں میں

کچھ آج میں نے نہیں پی ہے حضرتِ واعظ
ازل کا مست پُرانا شراب خوار ہوں میں

نگاہِ قہر سے مجھ کو نہ دیکھو اے دوزخ
خبر نہیں تجھے کس کا گناہ گار ہوں میں

وہ کشتہ ہوں کہ مری لاش جس طرف گزرے
زمیں پکار اُٹھے قابلِ مزار ہوں میں

وہ بے قرار ہوں دیکھے اگر تڑپ میری
قرار بھی یہ پکارے کہ بے قرار ہوں میں

ہٹے مزے سے گزرتی ہے بیخودی میں امیر
خدا وہ دن نہ دکھائے کہ ہوشیار ہوں میں

(۵۵) احمدی

نواب غلام احمد صاحب احمدی مرحوم یکم جنوری ۱۸۳۹ء کو بمقام کنج پورہ ضلع کرنال پیدا ہوئے۔ خاندان کنج پورہ جس کے نواب صاحب مرحوم ایک ممتاز رکن تھے پنجاب کے مشہور رئیس خاندانوں میں سے ایک ہے۔ اس خاندان کے مورث اعلیٰ نواب نجابت خاں صاحب تھے جو ۱۷۲۰ء کے قریب افغانستان سے آئے تھے۔ اور ضلع کرنال اور انبالہ میں ایک علاقہ پر حکومت حاصل کر کے کنج پورہ کو آباد کیا تھا جو اس وقت تک ریاست کنج پورہ کا صدر مقام ہے۔ نواب

غلام احمد خاں صاحب مرحوم تھا۔ ابتدائے عمر سے علمی مذاق رکھتے تھے اور بچپن ہی سے اُن کو شعر و
شاعری اور تصنیف کا شوق تھا چنانچہ دس برس کی عمر میں اُنھوں نے ایک قصہ بنام
"قصۂ کرشن" نظم میں لکھا تھا۔ عربی اور فارسی کی تکمیل کے بعد ایک مدت تک نواب صاحب
نے ملک میں سیر و سیاحت کی اور رائس کے پی۔ ایک عرصہ تک ریاست ٹونک میں مختلف
عہدوں پر ممتاز رہے ۱۸۷۵ء میں ریاست گوالیار میں ملازم ہوئے اور مہاراجہ جیاجی راؤ
نے ضلع عیسیٰ گڑھ کا انتظام ان کے سپرد کیا جس کا ذکر آج تک وہاں کی رعایا کے زبان زد
ہے ۱۸۸۶ء میں مہاراجہ جیاجی راؤ کی وفات پر گوالیار میں جب کونسل آف ریجنسی
قائم ہوئی اس وقت ریاست کے تمام مسلمان عہدہ داروں میں سے گورنمنٹ نے
صرف نواب صاحب کے سپرد اوّل صیغہ جوڈیشل اور پھر کو صیغہ تعلیم کیا جس کے
متعلق اُن کی خدمات آج تک ریاست میں مشہور ہیں اور جس کے اعتراف میں ۱۸۹۲ء میں
گورنمنٹ مہاراجہ کی طرف سے "نواب" کا خطاب مرحمت ہوا ۱۸۹۷ء میں کونسل کی مدت
ختم ہونے پر نواب صاحب فرائض منصبی سے سبکدوش ہو گئے اور آخر وقت
تک خیر کے کاموں میں مصروف رہے ۱۶ اپریل ۱۹۰۰ء مطابق ۱۳۱۸ھ کو
۶۲ سال کی عمر میں انتقال فرمایا۔ باوجود جلیل القدر عہدوں کی ذمہ داریوں میں
مصروف رہنے کے کبھی اپنے علمی مشاغل سے دست بردار نہ ہوئے خط و خال کی
شاعری جوانی میں ہی ترک کر دی تھی۔ توجہ زیادہ اخلاق اور سوشل مضامین پر
نثر اور نظم میں اُن کی تصانیف موجود ہیں، جن میں "مثنوی ہفت رانہ" "اثبات حق" اور

صبح نو، کو خاص شہرت حاصل ہی۔

(۱۴۰)

نشاں کیا کیا دکھائے تونے یارب بے نشاں ہوکر
عیاں کیا کچھ کیا ہی تونے اے خالق نہاں ہوکر
تمنا ہی ترے درپوزہ گر کی تجھ کو پہچانے
ترے در تک پہونچ جائے غبار جسم و جاں ہوکر
گلستاں میں گلوں کے کان ہیں آواز پر تیری
ترا ذکر خفی کرتا ہی ہر پتا زباں ہوکر
ترا جوشش کرم رفعت اگر دے اہل پستی کو
مہ و خور پہ زمیں سایہ فگن ہو آسماں ہوکر
تمنا ہی سراپا محو ذکر ذات باری ہوں
مرا ہر موئے تن سرگرم مدحت ہو زباں ہوکر
تماشوں میں تری قدرت کے آنکھیں محو حیرت ہیں
نرالا رنگ ہی پیش نظر گزرا جہاں ہوکر
جنھیں طفلی میں صرف بازی چوگان کو پایا
وہی محو خود آرائی نظر آئے جواں ہوکر

تنِ عُریاں کو ملبوس عنایت کی تمنّا ہے
لباسِ جسم پھٹ جائے گا اک دن دھجیاں ہو کر
کہاں کا ضبط کیسا ننگ جوشش یاد باری میں
دلِ بیتاب پہلو سے نکل بھاگا فغاں ہو کر
زباں کو میری گویا کر الٰہی اپنی مدحت میں
کروں مُردہ دلوں کو زندہ دل معجز بیاں ہو کر
ترے آثارِ قدرت پر کروں دلچسپ تقریریں
جھکاؤں گردنیں پیرانِ پیکر کی جواں ہو کر
کمر کستا ہوں تیرے نام پر تو مجھ کو ہمت دے
سہارے پر ترے اٹھتا ہوں تیرا مدح خواں ہو کر
جہاں بھولوں بتا جس جا بہک جاؤں ہدایت کر
جو ہو لغزش تو مجھکو تھام لے مہرباں ہو کر
بھروسے پر تری امداد کے بیڑا اُٹھایا ہے
فلک کے بوجھ اُٹھانے پر تلا ہوں ناتواں ہو کر

ترے در پر جبینِ احمدی سرگرم سجدہ ہے
تمنّا ہے یہیں رہ جائے خاکِ آستاں ہو کر

(۵۶) مجروح سنہ ۱۹۰۲ء

میر مہدی حسین خلف میر حسین فگار دہلوی۔ میرزا غالب کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ حالی۔ داغ۔ انور ظہیر کے ہمعصر تھے چنانچہ مولانا حالی فرماتے ہیں ؎

داغ و مجروح کو سن لو کہ پھر اس گلشن میں
نہ سنو گے کبھی بلبل کا ترانہ ہرگز

اردوئے معلی میں ان کے نام میرزا صاحب نے بہت سے خطوط لکھے ہیں دور موجودہ میں نازک خیال اور معنی یاب شاعر تھے مگر زمانہ کی ناقدری نے انھیں دہلی سے باہر نکال دیا ۱۳۲۰ھ مطابق سنہ ۱۹۰۲ء میں بمقام دہلی انتقال ہوا ان کا دیوان سنہ ۱۸۹۹ء میں شائع ہوا غالب کے رنگ میں قدیم طرز کی شاعری کرتے تھے نمونہ کلام یہ ہے:۔

(۱۴۱) غزل

کیا زلیخا ہو خوش گلستاں میں
دل تو اس کا پڑا ہے زنداں میں

یہ نزاکت اور اس پہ غیرت ہے
کیسی مضبوطیاں ہیں پیماں میں

تھی وہ مجنوں کے دم ہی تک رونق
خاک اڑتی ہے اب بیاباں میں

دل تو خستہ ہے نسیم بہار
چپ ہوں کیوں بلبلیں گلستاں میں

کس کو معلوم جان گم گشتہ نکلی
محو تھے ہم تو یاد جاناں میں

وہ نگاہیں ہیں رخنہ گر اے شیخ	پھر سے بیٹھے ہیں تیرے پیکاں میں
ہاں سنبھل بیٹھیو جنوں ہشیار!	تار باقی رہے نہ داماں میں
دل خراشی ہو یا جگر سوزی	کچھ تو مشغل روزِ ہجراں میں

دردِ دل کی نہیں دوا مجروح
آپ ناحق ہیں فکرِ درماں میں

(۵۶) ذکی سنہ ۱۹۰۳ء

سید محمد زکریا خاں صاحب خلف سید محمود خاں نبیرہ نواب اعظم الدولہ میر محمد خاں سرور دہلوی مولف تذکرہ شعرائے اردو سادات کشمیر سے ہیں ۱۲۵۵ھ مطابق ۱۸۳۹ء دہلی میں پیدا ہوئے فن شاعری میں مرزا غالب کے شاگرد تھے ان کو مرزا نے اپنی تحریر میں جو زکی کے مطبوعہ دیوان میں شامل ہے اچھا شعر کہنے والا اور اپنا شاگرد رشید لکھا ہے۔ الٰہ آباد بریلی گورکھپور اور آخر میں بدایوں میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس رہے ۱۳۲۱ھ مطابق ۱۹۰۳ء میں وفات پائی اور حضرت سید احمد صاحب والد نظام الدین اولیاؒ کی درگاہ کے باہر اس کی جنوبی دیوار کے زیر سایہ جانب مشرق دفن ہوئے۔ کلام یہ ہے:-

(۱۴۲)

ابھی تو بیٹھے ہی ہیں رونق کاشانہ ہو جائے	قفس ہی آشیانوں سے بدل کر [illegible] خانہ ہو جائے

تغافل سا نہ گا شوقِ اہلِ دور کیا ہوگا
ادا ایسی وہ فرمائیں الٰہی دل دیوانہ ہو جائے

نہ کہنا غیر سے قاصد کہ ہیں مطلب نہیں سمجھا
پیامِ یار ہر گز نہ بیگانہ ہو جائے

نہیں کیوں حضرتِ موسیٰ کی بیتابی کے ہم ہمرز
کہ رازِ دل زباں پر آئے اور افشا نہ ہو جائے

خانۂ بزمِ جہاں میں ہے وہ ذوقِ بادہ آشامی
کہ دورِ چرخ مجھ کو گردشِ پیمانہ ہو جائے

پھریں کیوں اس کی بزمِ ناز سے مجروح ہم بیگانہ
رفیقِ شوق یارب ہمتِ مردانہ ہو جائے

کہاں تک ضبطِ بیتابی دلِ مسکیں مجھے چھوڑ دے
نہ ہی تجھ سے تحمل تو وہ بے پروا نہ ہو جائے

تماشا عام ہوگا اور کیفِ بے خودی ازل
عجب کیا آئینہ سا محوِ حیرت مبتلا نہ ہو جائے

ادائے حسن میں ہو دخل اندازِ محبت کو
دلِ صد چاک اُس کے گیسوؤں کا شانہ ہو جائے

جنونِ عشق بھی ہے علم حکمت ورنہ کیا معنی
جو دیوانہ ترا ہو جائے وہ فرزانہ ہو جائے

فغاں کرتے ہوئے جا پہنچے اس کی بزمِ عشرت میں
کبھی تو اُن کی یہ شوخی زنانہ ہو جائے

(۱۴۳)

ہوا میں بُرا کی بُرائی تمہاری
بگڑتے ہو کیوں تم بن آئی تمہاری

مرے ایک نالے میں گھبرائے ایسے
ہوئی کیا ستم آزمائی تمہاری

نہ مجھ سے چھٹے گی نہ تم سے چھٹے گی
محبت مری بے وفائی تمہاری

ملا ہوں کبھی تو وحشت میں کیونکر ملوں میں
بجا ہے یہ نا آشنائی تمہاری

مرے اضطراب و قلق کی شکایت کیا
یہاں تم کو شوخی ہے لائی تمہاری

وہ زلفیں کھلیں گی کہیں حضرتِ دل | ہوئی سخت مشکل ۔ رہائی تمہاری

حسینوں کو چھپ چھپ کے تم دیکھتے ہو
ذکی دیکھ لی پارسائی تمہاری

(۵۸) داغ ۱۹۰۵ء

نواب میرزا خاں دہلوی شاگرد رشید ذوق دہلوی۔ ولادت دہلی محلہ بلی ماران ۱۲۴۶ھ مطابق ۱۸۳۱ء وفات حیدرآباد دکن میں بتاریخ ۹ ذی الحجہ ۱۳۲۲ھ مطابق ۱۵ فروری ۱۹۰۵ء یوم الجمعہ۔ ان کے حالات اس قدر شہرت پذیر ہیں کہ حاجت تحریر سے بے نیاز ہیں انھوں نے اپنی زندگی ہی میں وہ ناموری حاصل کی کہ کسی کو کم نصیب ہوئی ہوگی تقدیر پیرانہ سالی میں ایسی چمکی کہ عہد سلطنت مغلیہ میں کسی کسی خوش تقدیر اُستاد کے ساتھ زمانہ موافقت کرتا تھا حضور نظام سادس بادشاہ دکن کی قدردانی اور تعلیم نے ان کو چار چاند لگا دیئے۔ متاخرین دہلی میں ایسی اچھی زبان ایسی حاضر طبیعت ایسی دلپذیر غزل گوئی شاید ہی کسی کو ملی ہو لیکن مشق نے ان کو تبحر علمی اور زبان عربی و فارسی کی مہارت سے بے نیاز کر رکھا تھا اچھے اچھے اساتذۂ عصر کا کلام مشاعرے میں ان کے مقابل سرسبز نہ ہوتا تھا۔ یہ کچھ تو کلام کی برجستگی سادگی خیالات رنگین کی خوبی تھی اور کچھ پڑھنے کا انداز ایسا اعلیٰ ترین تھا کہ بابا وشاید اپنے اُستاد کی غزل قلعہ کے مشاعرے میں ہی پڑھا کرتے تھے اس لئے کہ اُستاد کو جہاں پناہ (ظفر) کی غزل پڑھنی ہوتی تھی

ایک مثنوی ''فریاد داغ'' کہ یہ نام تاریخی ہے سنہ ۱۳۰۰ھ میں تصنیف کی چار دیوان شائع ہو کر قبول عام حاصل کر چکے ہیں اور بچے بچے کی زبان پر اُن کا کلام ہے یہاں بطور نمونہ تھوڑا سا کلام پیش کیا جاتا ہے۔

غزل (۱۴۴)

غم سے کہیں نجات ملے چین پائیں ہم — دل خون میں نہائے تو گنگا نہائیں ہم

جورِ فلک میں خاک بھی لذت نہیں رہی — جی چاہتا ہے تیری جفائیں اُٹھائیں ہم

ڈر ہے نہ بھول جائے وہ سفاک روزِ حشر — دُنیا میں لکھتے جاتے ہیں اپنی خطائیں ہم

ناراض ہو خدا تو کریں بندگی سے خوش — معشوق روٹھ جائے تو کیونکر منائیں ہم

یہ آہ کوئے یار کے چکر ہے بے نصیب — لیتے ہیں اپنے پاؤں کی اکثر بلائیں ہم

تاثیر کو سلام کریں دونوں ہاتھ سے — جس وقت اپنے ہاتھ دُعا کو اُٹھائیں ہم

سونپا تمہیں خدا کو چلے ہم تو نامُراد — کچھ پڑھ کے بخشنا جو تمہیں یاد آئیں ہم

یہ جان تم نہ لوگے اگر آپ جائے گی — اس بے وفا کی خیر کہاں تک منائیں ہم

مانو کہا جفا نہ کرو تم وفا کے بعد — ایسا نہ ہو کہ پھیر لیں اُلٹی دُعائیں ہم

تو بھولنے کی چیز نہیں خوب یاد رکھ — اے داغ کس طرح تجھے دل سے بھلائیں ہم

(۱۴۵)

لذتِ سیر نہ گر چشمِ تماشا لے گی / ایک بار اور بھی دنیا ابھی پلٹا لے گی

شکوۂ دہر نہ بیدادِ فلک کی فریاد / حشر میں خلقِ خدا نام تمہارا لے گی

لٹ چکے جانِ دل صبر خرد دینِ وصال / کیا دھرا ہے شبِ غم آکے یہاں کیا لے گی

ایک آفت سی ہے برپا یہ ہماری ہستی / دیکھئے کب ترے دامن کا سہارا لے گی

چین سے آپ ہیں کچھ میری پروا نہ کریں / کیا شبِ ہجر بلا ہے جو مجھے کھا لے گی

دل کا سودا تیری زلفوں سے بنا رکھا تھا / کیا خبر تھی کہ نگہ مفت میں ہتیا لے گی

کام بگڑا نہ بنائے سے بنے گا ہرگز / میری تدبیر نہ تقدیر سے بدلا لے گی

شاہِ دیندار کا وہ فیض ہے جاری اے داغ
حشر تک جس سے مرے دین کے دنیا لے گی

(۱۴۶)

اے فلک چاہیے جی بھر کے نظارا ہم کو / جا کے آنا نہیں دنیا میں دوبارا ہم کو

کبھی ایسا نہ کنایہ نہ اشارا ہم کو / کم نگاہی نے تری جان سے مارا ہم کو

ہم کسی زلفِ پریشاں کی طرح اے تقدیر / خوب بگڑے تھے مگر خوب سنوارا ہم کو

جب کھنچے اُن سے ہوئے اور زیادہ مضطر
مرضِ عشق کے پرہیز نے مارا ہم کو

شکر صد شکر کہ اب قبر میں ہم جا پہونچے
توسنِ عمر نے منزل پہ اُتارا ہم کو

روزِ بازار کہے کون خریداروں سے
دل کی اس گرمیٔ بازار نے مارا ہم کو

چل تو اے دل رہِ الفت میں کہیں راہ نما
مل رہے گا کوئی اللہ کا پیارا ہم کو

اتنے ہم تا نہ کرو غیر پہ آفت ٹھہرے
پھر قیامت میں جو چھیڑ گئے دوبارہ ہم کو

باتیں اس آئینہ رو کی بھی ہیں گویا کہ طلسم
آج تو خوب ہی شیشے میں اُتارا ہم کو

آپ سے آپ نہ بہنے گا کوئی سودا اپنا
پھیر دیجے دلِ بیتاب ہمارا ہم کو

ہم سیہ رو ہیں سوادِ مردمکِ چشم سے بھی
پر جو دیکھے تو کہے آنکھ کا تارا ہم کو

باسلیقہ ہیں مزا کیا ہے مزہ ہے اس میں
کہ ہمارا ہے تمہیں پاس تمہارا ہم کو

بحرِ ہستی میں ہوئے کشتیٔ طوفانی ہم
نہیں ملتا کہیں اے داغ کنارا ہم کو

(١٤٧)

ثبات بحرِ جہاں میں اپنا فقط مثالِ حباب دیکھا
نہ جوش دیکھا نہ شور دیکھا نہ موج دیکھی نہ آب دیکھا
ہماری آنکھوں نے بھی تماشا عجب عجب انتخاب دیکھا
بُرائی دیکھی بھلائی دیکھی عذاب دیکھا ثواب دیکھا

نہ دل ہی ٹھہرا نہ آنکھ جھپکی نہ چین دیکھا نہ خواب دیکھا
خدا دکھائے نہ دشمنوں کو جو دوستی میں عذاب دیکھا

طرب میں جس سے ہی جان محزوں اسی کو گردش ہی ہے یہ چوں
کہ چرخ زن مثل دور گردوں مدام جام شراب دیکھا

نظر میں ہی تیری کبریائی سما گئی تیری خودنمائی
اگرچہ دیکھی بہت خدائی مگر نہ تیرا جواب دیکھا

پڑے ہوئے تھے ہزاروں پردے کلیم دیکھو تو جب بھی عشق کو
ہم اُس کی آنکھوں کے صدقے جس نے وہ جلوہ یوں بے حجاب دیکھا

جو راہ میں تیری آکے بیٹھے وہ فکر دیر و حرم سے چھوٹے
کہ تیرے کوچے کے ساکنوں نے بہشت میں بھی عذاب دیکھا

یہ دل تو اے عشق گھر ہے تیرا کہ جس کو تو نے بگاڑ ڈالا
مکاں سے تا لامکاں جو دیکھا تجھی کو خانہ خراب دیکھا

سرور عیش و نشاط کیسے بدل گئے رنگ ہی جہاں کے
سُنا نہ کانوں سے تھا جو ہم نے وہ آنکھوں سے انقلاب دیکھا

جو تجھ کو پایا تو کچھ نہ پایا یہ خاکداں ہم نے خاک پایا
جو تجھ کو دیکھا تو کچھ نہ دیکھا تمام عالم خراب دیکھا

شرابِ غفلت سے داغِ عشق پھر دکھائے غفلت نے کیا تماشے
کہ سوتے سوتے چونک اٹھے مگر کوئی تم نے خواب دیکھا

(۱۷۸)

ستم ہی کرنا جفا ہی کرنا نگاہِ الفت کبھی نہ کرنا
تمھیں قسم ہے ہمارے سر کی ہمارے حق میں کمی نہ کرنا
ہماری میت پہ تم جو آنا تو چار آنسو بہا کے جانا
ذرا رہے پاس آبرو بھی کہیں ہماری ہنسی نہ کرنا
کہاں کا آنا کہاں کا جانا وہ جانتے ہی نہیں یہ رسمیں
وہاں ہے وعدے کی بھی یہ صورت کبھی تو کرنا کبھی نہ کرنا
لئے تو چلتے ہیں حضرتِ دل تمھیں بھی اس انجمن میں لیکن
ہمارے پہلو میں بیٹھ کر تم ہمیں سے پہلو تہی نہ کرنا
نہیں ہے آسان قتل ان کا یہ سخت جاں بھی بڑی بلا ہیں
قضا کو پہلے شریک کرنا یہ کام اپنی خوشی نہ کرنا
ہلاک انداز وصل کرنا کہ پردہ رہ جائے کچھ ہمارا
غمِ جدائی میں خاک کرکے کہیں عدو کی خوشی نہ کرنا
مری تو ہے بات زہر ان کو وہ ان کے مطلب ہی کی نہ کیوں ہو
کہ ان سے جو التجا سے کہنا غضب ہے ان کا وہی نہ کرنا

ہوا ہی گر شوق آئینے سے تو رخ رہو راستی کی جانب
مثال عارض صفائی رکھنا برنگ کاکل کجی نہ کرنا

وہ اک ہمارا طریق الفت کہ دشمنوں سے بھی مل کے چلنا
یہ ایک شیوہ ترا ستمگر کہ دوست سے دوستی نہ کرنا

ہم ایک رشتہ گلی کا اُس کی دکھائے دل کو ہوئے پشیماں
یہ حضرت خضر کو جتا دو کسی کی تم رہبری نہ کرنا

بیان درد فراق کیسا کہ ہے یہاں اپنی یہ حقیقت
جو بات کرنی تو نالہ کرنا نہیں تو وہ بھی کبھی نہ کرنا

مدار ہے ناصحو تمہیں پر تمام اب اس کی منصفی کا
ذرا تو کہنا خدا لگی بھی فقط سخن پروری نہ کرنا

بری ہے اے داغ راہ الفت خدا نہ لیجائے ایسے رستے
جو اپنی تم خیر چاہتے ہو تو بھول کر دل لگی نہ کرنا

(۵۹) محسن ۱۹۰۵ء

مولوی محمد محسن خلف مولوی حسن بخش علوی۔ آپ قصبہ کاکوری کے ایک شریف خاندان کے رکن تھے جو عہد ماضیہ میں علمی اعتبار سے نامور تھا اور اس کے فضل و کمال کا مقام ہندوستان

میں شہرہ تھا۔ ۱۲۴۶ھ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی کلام جوانی میں مولوی ہادی علی صاحب شاگرد
برق لکھنوی کو دکھایا اس لئے لکھنؤ کی طرز خاص کے موجد ہو گئے۔ اور دہر جات
کے مشہور ہیں۔ ایک عرصہ تک کامل بیٹھے بیں بریلی میں وکالت کرتے تھے۔ ۱۰ صفر ۱۳۲۳ھ
مطابق ۱۴ اپریل ۱۹۰۵ء میں وہیں آپ کا انتقال ہو گیا۔ زبان کی صفائی کے ساتھ
کلام سوز و گداز اور جذبات سے پُر ہوتا ہے۔ نمونہ یہ ہے:-

(۱۷۹) عشق و محبت کی بے چینی کا نقشہ

ایک نظر مہر کی مجھ پر ساقی
مہرباں تشنہ لبوں پر ہو جا
کشتی نے چلے میرے بغیر
کر دے سرشار مجھے تو بھر کے
گردشِ جامِ شرابی ساقی
غرق کرتا ہے تلاطم مجھ کو
یہ بھی اک آفت ہے شباب ساقی
چھینٹے دے دے کے رُلاتا ہے مجھے
ہیں کیا رنگ جماتے محسن

ماہرو آئینہ بکف ساقی
دل کی لہروں کا تماشا ہو جا
پھیرے دریا تیرے بیڑے کی خیر
شیشہ شراب کی یہ صراحی بھر کے
دم آئے دم آئے لبِ ساقی
آج للہ کوئی جشن مجھ کو
پیار کرتا ہے مخاطب ساقی
غیر بن بن کے بتاتا ہے مجھے
مست کیوں ہو گئے پیالے محسن

نہ وہ صورت نہ وہ سیرت تیری
اُڑ گیا رنگ ترا بو ہو کر
حیف حالت تری نکھ پائی ہوئی
لب پہ آئے ہوئے نالے پیہم
چہرہ ڈوبا ہوا حیرانی میں
زردی چھائی ہوئی رخساروں پر
مُردنی چھائی ہے چہرہ دیکھو
چھپ گیا چاند ستارہ ہو کر
ہر دم اک رنگ بدلتا ہے کیوں
یہ اگر کھیل تھے گلکاری کے
کامدانی کا پہننا چھوڑا
رنگ اُڑ جائے بکھر جانے لگا
نیند آنکھیں کئی روتے دیکھا
کس بلا کا تو ہوا ہے مجنوں
کوہ پر جا کے اگر سر مارے
باتیں کرتے ہو تو رک جاتے ہو
کبھی ملتے ہو تو بر لگنے سے

یار کیا ہوگئی حالت تیری
بہہ گیا خون دل آنسو ہو کر
ہائے صورت تری مرجھائی ہوئی
ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں پُر نم
عرق آیا ہوا پیشانی پر
سرسوں پھولی ہوئی انگاروں پر
اندھی چھائی ہوئی دنیا دیکھو
اُڑ گیا آئینہ پارہ ہو کر
شمع کی طرح سے جلتا ہے کیوں
جن کی کلیوں میں چھپے ہیں کانٹے
لٹ گیا تیرا سہانا جوڑا
ناتوانی کو بھی غش آنے لگا
رات ہم نے تجھے سوتے دیکھا
لیلے لکھتی ملا تیرہ لیلیوں
لو کسی نے بھی تجھے پتھر مارے
آپ ہی چھیڑ کے شرماتے ہو
کبھی ہنستے ہو تو دیوانے سے

شہر کا سیر تماشا چھوڑا
رکھدیئے موسم گل میں کیونکر
آشنا گل کے نہ سوسن کے رہے
بیٹھے جنگل میں نہ یکسو ہوکر
سنجہ میں تیرا گلا ہوتا ہے
کسی بت نے تجھے حیران کیا
بیٹھے بٹھلائے یہ سودا تجھ کو
دیکھ پھر آئیں تری پھر آنکھیں
خون میں ڈوبی نگاہیں کیسی
بگڑی کیوں ہے مرے بسمل چتون
عشق گیسو نے یہ عقدہ کھولا
جال پھیلائے ہیں تتر والے
جان لیتے ہیں بکھرنے والے
دل لگا ہے تو پشیمانی کیوں
آبرو کی تجھے پروا کب تک
ہوش میں آؤ سمجھ والے ہو
نشو کہیں ایک زمانی آخر

چاندنی چوک کا رستہ چھوڑا
طاق نسیاں پہ دھرے ساغر
باغ میں تم تو خزاں بن کے رہے
کالے کوسوں پھرے آہو ہوکر
قیس لیلیٰ پہ خفا ہوتا ہے
کسی کافر نے مسلمان کیا
کیا ہوا میری کنہیا تجھ کو
یاد آئیں تجھے کافر آنکھیں
ہیں مری جان پہ آئیں کیسی
یاد آئی کوئی قاتل چتون
سر پہ چڑھ کر ترے جادو بولا
بال کھولے ہوئے گھونگر والے
تم سلامت رہو مرنے والے
جان کی فکر مرے جانی کیوں
ننگ و ناموس کا کھٹکا کب تک
تم تو بے پیئے متوالے ہو
مٹ گئی تیری جوانی آخر

چاندنی پچھلے پہر کی کب تک
دلِ ناشاد کو رکھ قابو میں
بس مجھے آتے ہیں چکر ساقی
ہاتھ لینا مجھے غش آتا ہے
تیری محفل کا یہی طور رہا ہے

روشنی شمعِ سحر کی کب تک
نہ سہی یار نہ ہو پہلو میں
لے مرے ہاتھ سے ساغر ساقی
دل کہیں اور لیے جاتا ہے
دورِ رقیب تک لیے یہ دور رہا ہے

(۱۴۰) ارشد سنہ ۱۹۰۶ء

ارشد صاحب عالم میرزا نبی الٰہی گورگانی دہلوی خلف میرزا اعلیٰ بہادر
سلسلۂ نسب حضرت اکبر شاہ بادشاہ تک پہونچتا ہے۔ آپ کی پیدائش قلعہ دہلی میں ہوئی
غدر میں چھ سات برس کی عمر تھی شاہزادہ میرزا قادر بخش صاحب سے علم عروض حاصل
کیا اور فن سخن میں ان کے شاگرد ہو گئے۔ شاعری کے علاوہ فن موسیقی میں بھی کمال استعداد
تھی۔ مرثیہ سلام پڑھنے کا شوق تھا۔ تاریخ گوئی میں کامل تھے طرز قدیم کے علاوہ جدید
طرز میں بھی نظم لکھتے تھے۔ سررشتہ تعلیم پنجاب میں ملازم تھے ان کی عمر کا زیادہ حصہ فیروزپور
میں گزرا تھا ۱۲ فروری سنہ ۱۹۰۶ء مطابق سنہ ۱۳۲۴ھ کو ملتان میں انتقال کیا کوئی
دیوان نہیں چھپا۔ نمونہ کلام یہ ہے:-

غزل (۱۵۰)

الٰہی جان دی ہے میں نے کس کے روئے روشن پر
ہزاروں شمعیں پروانہ بنی ہیں میرے مدفن پر

اُگا ہے پنجۂ مرجاں جو اپنی خاک مدفن پر
تو وقتِ فاتحہ ہے بدگماں کا ہاتھ دامن پر

تعجب کیا خمیدہ ہو اگر تلوار قاتل کی
چڑھا ہے خون کس کس بے گنہ کا اس کی گردن پر

وہ بے انصاف اور اپنی وفا کی داد یا قسمت
گمانِ دوستی ہے سادگی سے ہم کو دشمن پر

نہیں کھلتا نہیں کھلتا کہ مجھ سے کیا رکاوٹ ہے
کہ کچھ رک رک کے چلتی ہے تری تلوار گردن پر

عجب اُس جلوۂ یکتا میں نیرنگِ تماشا ہے
نئی صورت سے چمکا خاطرِ شیخ و برہمن پر

میں ہوں مرہونِ منت صلح کل کا جب سے اے ارشد
یقینِ دوستی ہونے لگا ہے مجھ کو دشمن پر

(۶۱) راسخ ۱۹۰۷ء

مولوی حافظ عبدالرحمٰن راسخ دہلوی خلف دوم مولوی محمد حسین فقیر ان کے دادا مولوی محمد اسمٰعیل مدارالمہام ریاست پاٹودی کا اصلی وطن سامانہ علاقہ ریاست پٹیالہ تھا کچھ عرصہ تک بستی قصبہ مظفرنگر میں سکونت اختیار کی اسکے بعد دہلی آگئے۔ مولانا راسخ کے والد خاقانی ہند استاد ذوق کے شاگرد تھے انہیں سے استفادہ سخن کیا مولانا راسخ نے نویں سال کلام مجید حفظ کر کے مسجد میں محراب سنادی تھی۔ نثر نگاری اور شعر و شاعری کا شوق ابتداہی سے تھا۔ اسی سلسلہ میں بے مثال پنج جاری کیا خیر خواہ عالم چلتا پرزہ افضل الاخبار اور دہلی پنچ کی ایڈیٹری کی۔ مگر چونکہ ان کے والد دوران طالب علمی میں ان اشغال سے ناخوش تھے اس لئے حصول تعلیم میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔ فضیلت کی سند حاصل کی اور وعظ گوئی میں کمال حاصل کیا۔ اسی زمانے میں مثنوی مولانا روم کی نظم کی شرح لکھی جس کے دو دفتر شائع بھی ہو گئے۔ آخر میں اردو شاعری ترک کر دی تھی کبھی کبھی فارسی میں کچھ لکھ لیتے تھے ۲۹ ستمبر ۱۹۰۷ء مطابق ۱۳۲۵ھ بعمر ۴۴ سال انتقال کیا اور مہندیوں کے قبرستان میں حریم محدثین کے اندر شرقی دیوار کے زیر سایہ دفن ہوئے مرات الخیال اور کمال راسخ دو مطبوعہ دیوان سے یادگار ہیں۔ اولاد نہیں چھوڑی

(۱۵۱) غزل

کہاں سے تھے شب ادھر دیکھو حیا کیوں ہو نگاہوں میں

اگر منظور ہی رکھو تو مجھے جھوٹے گواہوں میں
سیہ کاری مری بن جائے رشک گیسوئے خوباں
قیامت کو چھپا بیٹھا رہوں یارب گناہوں میں
مؤحد وہ ہوں گر میں سرِ وحدت کان میں کہہ دوں
مؤذن بُت کدہ میں ہوں برہمن خانقاہوں میں
نظر مجھ سے چُرا کر منہ چھپا کر کیسے جاتے ہیں
کہ یہ چوری بھی لکھی جائے گی تیرے گناہوں میں
تعجب کیا ہے نکلے کوئی دن میں مانگ بھی ٹیڑھی
غضب کا بانکپن دیکھا ہے ہم نے کج کلاہوں میں
نہ میں عرش بریں پر ہوں نہ میں فرش زمیں پر ہوں
مری ہستی ہے گویا نیستی میری نگاہوں میں
لبوں کے بوسے دے دے کر عدو کو کیوں مکرتے ہو
زباں شامل نہ ہو جائے کہیں جھوٹے گواہوں میں
عدو بل جُل کے گر مجھ سے کریں نالے تو اچھا ہے
ملے دادِ ستم اپکا اگر ہو دادخواہوں میں
حجابِ دیدۂ خود بیں، حجابِ خاطر بد بیں
پڑے رہتے ہیں یہ پردے تمہاری جلوہ گاہوں میں

ہماری طرح نم پر بوالہوس مرکیوں نہیں جاتے
اگر ہیں جان نثاروں میں اگر ہیں دادخواہوں میں

دبا کر رکھ لیا ہے چال میں محشر کے فتنوں کو
جگا کر رکھ لیا ہے شوخ نے جادو نگاہوں میں

جگر بھی خوش ہو دل بھی خوش کہیں بنجیں کہیں نکلیں
غضب کی میٹھی چھریاں ہیں تری نیچی نگاہوں میں

وہی راسخ نو ہیں کل تک جو مے خانے کے درباں تھے
نے بیٹھے ہیں حضرت چار دن سے دیں پناہوں میں

(۶۲) شہباز ۱۹۰۸ء

شہباز ی سید محمد عبد الغفور خلف سید طالب علی ضلع پٹنہ کے رہنے والے تھے ابتدا سے مضمون نگاری کا شوق تھا اخبار دارالسلطنت و اردو گائڈ کلکتہ کے اڈیٹر رہے تھے۔ اس کے بعد ریاست حیدر آباد میں تعلق ہو گیا، یہاں اورنگ آباد کالج میں پروفیسری کے عہدے پر ممتاز رہے بھوپال میں سررشتہ تعلیم کے ڈائرکٹر تھے اردو کے علاوہ فارسی زبان میں بھی برجستہ شعر کہتے تھے آپ اخبار اودھ پنچ لکھنؤ کے ممتاز نامہ نگاروں میں تھے آپ کی نظم کا مجموعہ حیات شہباز کے نام سے ۱۹۱۵ء میں نظامی پریس بدایوں چھپا ہے ان کی نظموں میں فلسفہ انسانی کی باریکیاں اور قدرت کے نکات صاف اور ستھری زبان میں

نظر آتے ہیں۔ ۲۰ر نومبر ۱۹۰۸ء مطابق ۱۳۲۶ھ کو وفات پائی۔ کلام کا انتخاب درج ذیل ہے۔

(۱۵۲) سمندر

بڑی ہی اک عظیم الشان شے ہے
ہزاروں جس میں مخفی گنج شاہی
زیادہ جس کی گہرائی خرد سے
خیالوں سے بڑا پھیلاؤ جس کا
فلک جس کے قدم لینے کو جھک جائے
ستارے جس پہ شیدا ماہ مفتوں
گھٹا جھکی ہوئی جس کی بدولت
پہاڑوں کو جہاں روڑوں کا رتبہ

پڑے جس میں کروڑوں بن طے سے
کروڑوں جس میں اسرار الٰہی
عیاں جس کی اونچائی نقطۂ مد سے
سمیٹے خوبیاں سنسار جس کا
زمانہ جس پہ دم لینے کو رک جائے
بلا گرداں ہو جس کا مہر گردوں
شفق پھولی ہوئی جس کی بدولت
جہاں موروں سے کم گھوڑوں کا رتبہ

جہاں طوفانِ نوح اک موج نوخیز
جہاں خود چشم قدرت حیرت آمیز

(۱۵۳) صبح پیری

کیلئے جانے سے کے لال تھے مدت گیسو سپید
سیمیں بدن مو ہیں طنابیں ہیں نور کی
اب کیجیے رہا کے معرکۂ زندگی کے کام

نزلہ جھکا وہ ریش پہ اب یہ غضب ہوا
خیمہ سحر کا آن گڑا کوچ شب ہوا
ہونا تھا جتنا بزم میں عیش و طرب ہوا

کیا دیکھیے آئینہ کوئی؟ منہ ہی نہیں ہے جب
بیکار ہی جو قبضے میں شہر حلب ہوا

آنکھوں کی دوربینوں میں بھی اب نہیں وہ زور
دانتوں کا بھی حصار مرمت طلب ہوا

جاسوس کان کیسے پڑے سوتے ہیں بے خبر
انکی بلا سے دہر میں شور و شغب ہوا

طاقت کہاں بیان ہی کیا دیجیے گلوں کو طول
مجبوریوں سے وردِ زباں شکر رب ہوا

وہ دن کہاں کہ صبح سے ہو سیر چوک کی
بازار عیش گرم جہاں۔ فتنۂ شب ہوا

پاؤں کے راہوار اٹھاتے نہیں قدم
کمری جو ایک بیکٹ ہوئے۔ کیا سبب ہوا

اعضا جو بگڑے پھر نہ ہوئے ایک مستقیم
معدے ہیں گرچہ ہضم مسلم مطب ہوا

شہباز گو کہ فن سے تھا درجہ بزرگ
کیونکر خیال نافلہ و مستحب ہوا

جب تک رہا وہ ہند میں تھا شیخ فاسقاں
کعبے گیا تو قبلۂ شیخ العرب ہوا

(۶۳) راقم ۱۹۰۹ء

خواجہ قمر الدین دہلوی بدر الدین مترجم بوستان خیال کے بیٹے تھے میرزا غالب مرحوم کے شاگرد ریاست جے پور کے وظیفہ خوار تھے آخر عمر میں دہلی چھوڑ کر وہیں چلے گئے تھے اُن کا دیوان ۱۸۹۶ء میں افضل المطابع دہلی میں طبع ہو چکا ہے ۱۹۰۹ء کے قریب انتقال ہوا۔ ان کی ایک کتاب تعلیم نسواں میں "عقد ثریا" کے نام سے یادگار ہے۔

(۱۵۴) غزل

بانت کیونکر بنے امید بر آئے کیونکر
نالہ پُر شور نہیں آہ شرربار نہیں

آج آئے ہیں مرے شکووں کا لینے وہ حساب مجھ سے نفرت سہی لذت کش آزار تو ہوں	خیر ہی ہاتھ میں اُن کے کوئی تلوار نہیں غیر پھر غیر ہے وہ خوگر آزار نہیں

جوش مستی میں کہاں چلے آئے کہاں تم راقم
یہ تو مسجد ہی چلو خانۂ خمّار نہیں

(۹۴) جلیب ۱۹۰۹ء

محمد کاظم آپ کا سلسلہ نسب سید حمزہ ابن موسیٰ کاظم علیہ السلام تک پہونچتا ہے اور قصبہ کنتور ملک اودھ کے رہنے والے گیارہ برس کی عمر سے شعر و سخن کا شوق ہوا سب سے پہلے اپنا کلام سید لطف اللہ قدر رضا گردناسخ کو دکھایا پھر سید حسین مرزا عاشق لکھنوی سے استفادہ سخن حاصل کیا جو ناسخ کے قابل شاگرد تھے آپ ریاست حیدرآباد میں طازم تھے ۱۹۰۹ء میں وفات پائی۔ کلام کا انتخاب یہ ہے۔

(۱۵۵) غزل

حُسن جب صورت گرِ ذوقِ خود آرائی ہوا
ہر صفت بے باک گرم لاف یکتائی ہوا
عشق نے سارے زمانے کو بنایا بدگماں
خود بخود میرا تڑپنا وجہ رسوائی ہوا

اِک جہاں شیدا ہے صورت آشنا کوئی نہیں
سب کو اپنا کر لیا کس کا وہ ہرجائی ہوا

کچھ بجز غفلت نہ ہاتھ آیا متاعِ دہر سے
مالِ دُنیا صرفِ شغلِ بادہ پیمائی ہوا

دستِ قدرت نے دکھائیں ایسی شکلیں کھینچکر
کوئی از خود رفتہ اور کوئی تماشائی ہوا

کون ہو سکتا تھا دُنیا میں کسی کا روشناس
چھپ کے ہر پردہ میں تو وجہ شناسائی ہوا

اے مسبب دور کر دے رنج و حرماں لو جلیلؔ
وہ بھی کوئی شے ہے جس کا یہ تمنائی ہوا

(۶۵) جلالؔ ۱۹۰۹ء

سید ضامن علی خلف حکیم اصغر علی لکھنوی۔ مرزا امیر برقؔ و رشکؔ شاگردان ناسخؔ کی تلامذہ میں تھے تحقیق میں اچھی دستگاہ تھی ان کی تصانیف ان کی قابلیت کی شاہد ہیں تنقیح اللغات افادۂ تاریخ۔ رسالۂ عروض سرمایۂ زبان اُردو (لغت) اور چند دیوان اُن سے یادگار ہیں اُنھوں نے اپنی وفات پر لکھنؤ میں اپنا ہمسر کوئی نہ چھوڑا ۱۳۲۷ھ

مطابق ۱۹۰۹ء انتقال ہوا بہت سے شاگرد چھوڑے۔ نمونہ کلام یہ ہے:۔

(۱۵۶)

جذبِ دل کھینچ اسے دست و گریباں ہوکر
دے جگہ یار کو پہلو میں رگِ جاں ہوکر
خوش نگاہوں کے کرشمے کوئی ہم سے پوچھے
آنکھ میں کرتے ہیں گھر آنکھ میں پنہاں ہوکر
دست وحشت سے کہوں گا کہ اسے بھی کر چاک
دل مجھے تنگ کرے گا جو گریباں ہوکر
حسرتِ ناوکِ قاتل میں جو دل بھر آیا
آنسو آنکھوں میں کھٹکنے لگے پیکاں ہوکر
نزع میں اس لئے کھولے ہوئے بال آئے ہیں وہ
روح عاشق کی جو نکلے تو پریشاں ہوکر
ہائے اُس شوخ کی شرمندگیٔ جور و ستم
مار ڈالا ہمیں ظالم نے پشیماں ہوکر
محفلِ یار سے کیوں کر نہ نکالے جاتے
ہم گئے تھے ہمہ تن حسرت و ارماں ہوکر

بے وفائی میں نہ تھا یار سے کم عہدِ شباب
چلدیا صبح کو اک رات کا مہماں ہوکر

نہ رہے ہم سے سیہ بخت کو کیا غم ہی جلال
دیکھئے رہتی ہے کس کی شب ہجراں ہوکر

(۱۵۷)

اُس سے کچھ ذکر مرا بھی دلِ ناشاد رہے
کسی بے درد کو میں حال سنالوں اپنا
یار کی ایک جفا کے مرے دل میں سو داغ
نامرادوں کی ہوئیں آج مرادیں پوری
روح جنت میں دل ہم میں ہم مدفن میں
اب کسی سے یہ کہیں کے کہ ہمیں کچھ ہی دے

وقت پر بھول نہ جانا یہ تجھے یاد رہے
نالہ خاموش ہے چپ ابھی فریاد رہے
سو وفائیں مری اور اک نہ اسے یاد رہے
ہم کو ناشاد لقب اس نے دیا شاد رہے
تیرے آوارہ پس مرگ بھی برباد رہے
شاد ہونے کی تمنا ہیں تو ناشاد رہے

خیر بھولے نہیں وہ تیری وفاؤں کو جلال
یہ غنیمت ہی کہ جور اپنے انھیں یاد رہے

(۶۶) آزاد سنہ ۱۹۱۰ء

یہ وفیسر مولوی محمد حسین آزاد شمس العلماء ان کے والد کا نام محمد باقر تھا جو شرفاء دہلی

ہیں ایک مشہور شخص تھے اُنھوں نے ۱۸۹۶ء میں اُردو زبان کا سب سے پہلا اخبار دہلی سے شائع کیا تھا وہ شاعر بھی تھے اور اُستاد ذوق سے تلمذ رکھتے تھے لیکن ان کا کلام مشہور نہیں ہوا نہ دیوان چھپا اُن کو اُردو نثر میں اپنے خاص رنگ کے سبب بہت کچھ شہرت حاصل ہوئی۔ شاہراہ قدیم سے ہٹ کر اردو شاعری میں ایک جدید روش پیدا کرنے کا خیال سب سے پہلے انھیں کو آیا تھا۔ آزاد کی طرز تحریر نظم و نثر دونوں کسی تعریف کی محتاج نہیں بیان کی لطافت زبان کی سلاست بندش کی چستی اور محاورے کی دل آویزی سب کچھ ان کے یہاں موجود ہے ان کی کثیر تصنیفات میں دربار اکبری نیرنگ خیال سخندان پارس آب حیات مشہور اور مقبول ہیں۔ ان کا کچھ کلام مجموعہ نظم آزاد کے نام سے چھپ گیا ہے ۱۸۹۹ء میں ایک دماغی مرض میں مبتلا ہو گئے تھے لیکن اس وقت بھی عالمانہ خیالات ہی دماغ میں چکر لگاتے تھے جس کی جھلک "سیاک و نماک" میں پائی جاتی ہے جو اسی زمانۂ جنون کی تصنیف ہے ۱۹۱۰ء مطابق ۱۳۲۸ھ میں بمقام لاہور انتقال ہوا۔

کلام کا انتخاب یہ ہے:-

(۱۵۸) خسروِ امن کا دربار علم

دفعتاً دیکھا کہ اک پیرِ کہن سال آئے
پُر عجب شان سے وہ مردِ خوش اعمال آئے

جسمِ پُر نور میں پہنے ہوئے جامہ کالا
بر میں جبّہ عربی سر پہ عمامہ کالا

پاؤں تک شملۂ دستار جو آجاتا تھا
ان کی مقدار فضیلت کو بتا جاتا تھا

لاغری چہرہ پہ ہر چند کہ چھائی تھی بہت
رُخ کی عینک نے مگر شان بڑھائی تھی بہت

شانہ تھا ریشِ مقدّس میں کیا پیری نے
اور جھکایا تھا بڑھاپے کی زمیں گیری نے

ساتھ کچھ لوگ کتابیں تھے اُٹھائے آئے
اور بغل میں کئی جزدان دبائے آئے

سب کے سب پیچھے بصد صدق و صفا آتے تھے
ٹیکتے آپ کرامت کا عصا آتے تھے

الغرض بادشہِ امن کے آگے آئے
پہلے سر نیچے باادب دستِ دعا پھیلائے

پھر یہ کی عرض کہ آئے ہیں وکالت کیلئے
علم نے بھیجا ہے تقدیمِ رسالت کے لئے

اہلِ تصنیف ہیں تصنیف میں مصروف سدا
ہے ہر اک شہرت و تعریف میں مصروف سدا

اہلِ تحصیل کو پڑھنے کے سوا کام نہیں
اور جہاں میں انھیں فکرِ سحر و شام نہیں

دم بدم علم سے کرتا عمل ایجاد نئے
آتے ہیں کارگہِ دہر میں استاد نئے

درس و تدریس کے چرچے ہیں جو گھر گھر جاری
ہیں یہ جمعیتِ خاطر ہی کی باتیں ساری

جو ہمیں چاہئیں موجود ہیں سارے ساماں
ملتے ہیں پہلے ضرورت سے ہمارے ساماں

اے شہِ امن یہ سب فیض و کرم تیرے ہیں
کشورِ علم میں سب بھر رہے دم تیرے ہیں

تو نہ ہووے تو ابھی خلق میں طوفاں ہو جائے
سب کا شیرازۂ اوراق پریشاں ہو جائے

(۱۵۹) زمستاں

جاڑے کے مارے چلتے ہوئے پانی تھم گئے
اور جو تھمے ہوئے تھے وہ یخ ہو کے جم گئے

دامانِ کوہسار میں سورج بھی لیٹ کر
دبکا غلافِ برف میں منہ کو لپیٹ کر

دیکھو جو گھر کو سب در و دیوار تھے سفید
باہر چلو تو دامن کوہسار تھے سفید

سنسان جنگل اور درختوں کی سائیں سائیں
چاروں طرف پہاڑ ہیں ہیں دوڑتی بلائیں

طوفان برف سر پہ کھڑا ہے تلا ہوا
ہے یہ درہ کہ موت کا منہ ہے کھلا ہوا

موسم بھی معتدل ہے ہوا ہے بہک گئی
خوشبو کا ہے یہ حال کہ دنیا مہک گئی

پانی کی ہیں پہاڑ سے آوازیں آ رہیں
جو زیر و بم کے دور رہے ہیں تم طار ہیں

(۱۶۰) صبح کا سماں

ناگہ فلک پہ دامن شب چاک ہو گیا
لبریز نور سے طبق خاک ہو گیا

منہ رات کا جو صبح کے آنے سے فق ہوا
گلگونہ لے کے سامنے رنگ شفق ہوا

روئے سحر پہ نشان تھی نور ظہور کی
چاروں طرف وہ زمزمہ خوانی طیور کی

وہ گہری سبزیوں میں گل تر کی لالیاں
اور اوس سے بھری ہوئی پھولوں کی پیالیاں

وہ صبح کی ہوا سے درختوں کا جھومنا
اور جھوم جھوم کر وہ رخ گل کا چومنا

سبزی جو روئے خاک پہ مخمل بچھا گئی
شبنم تھی آ کے رات کو موتی گرا گئی

پانی وہ صاف صاف جو بل کھا کے جاتے تھے
پارے کے سانپ گھاس پہ لہرا کے جاتے تھے

(۶۷) سرور سنہ ۱۹۱۱ء

منشی درگا سہائے ولد حکیم پیارے لال قصبہ جہان آباد ضلع پیلی بھیت کے باشندے تھے وہیں سنہ ۱۸۷۳ء میں پیدا ہوئے زمانہ طالب علمی سے اساتذہ کے کلام کے مطالعہ کا شوق تھا فطرت نے شاعری کا جو مادہ طبیعت میں ودیعت کیا تھا اس مطالعہ سے وہ اُبھر آیا اور خود بھی شعر کہنے لگے زیادہ تر نیچرل نظمیں کہتے تھے جن کو ہندوستان کے اہل اُردو ہاتھوں ہاتھ لیتے تھے سنہ ۱۹۱۱ء میں ان کی نظموں کا مجموعہ "زمانہ پریس" کانپور میں چھپا ہے ۳ دسمبر ۱۹۱۱ء مطابق سنہ ۱۳۲۹ھ کو ۳۷ سال کی عمر میں جوان فوت ہو گئے۔

کلام کا انتخاب یہ ہے:۔

(۱۶۱) دل بے قرار سو جا

کسی مست خواب کا ہی عبث انتظار سو جا
کہ گزر گئی شب آدھی دل بے قرار سو جا

یہ نسیم ٹھنڈی ٹھنڈی یہ ہوا کے سرد جھونکے
تجھے دے رہے ہیں لوری دل بے قرار سو جا

یہ تری صدائے نالہ مجھے متہم نہ کر دے
مرے پردہ دار سوجا مرے راز دار سوجا
مجھے خوں رُلا رہا ہے ترا دم بدم تڑپنا
ترے غم میں آہ کب سے ہوں میں اشکبار سوجا
ابھی دھان پان ہے تو نہیں عاشقی کے قابل
یہ تپش کا آہ شیوہ نہ کر اختیار سوجا
نہ تڑپ زمیں پہ ظالم تجھے گود میں اٹھا لوں
تجھے سینہ سے لگا لوں تجھے کر لوں پیار سوجا
تجھے جن کا ہے تصوّر ارے مستِ جامِ الفت
انھیں انکھڑیوں کے صدقے مرے بادہ خوار سوجا
تجھے پہلا سابقہ ہے شبِ غم بُری بلا ہے
کہیں مر مٹے نہ ظالم دلِ بے قرار سوجا

(۶۸) ظہیر ۱۹۱۱ء

نواب مرزا سید ظہیر الدین حسین دہلوی خلف اکبر سید جلال الدین حیدر صلاح الدولہ مرصع رقم خاں اُستاد بہادر شاہ ظفر مرحوم خاقانی ہند ذوقؔ کے نامور شاگرد تھے دربار شاہی

سے چودہ سال کی عمر میں "راقم الدولہ" کا خطاب مع قلمدان شاہی عطا ہوا تھا۔ وہ موجود کے اساتذہ بہیر میں سربرآوردہ تھے غزل، قصیدہ، رُباعی، مسدس، مخمس، مثنوی غرض جملہ اصناف سخن پر قدرت رکھتے تھے۔ غدر کے بعد ریاست جے پور میں چلے گئے تھے وہاں کچھ دنوں رہے اس کے بعد ریاست ٹونک میں ملازم ہو گئے غفران مآب ہز ہائی نس میر محبوب علی خاں والی دکن کی قدر افزائی کا شہرہ سنکر ریاست حیدر آباد میں تشریف لائے دربار تک رسائی نہ ہونے پائی تھی کہ علیل ہو گئے اور مارچ سنہ ۱۹۱۱ء مطابق ۱۷ ربیع الاول سنہ ۱۳۲۹ھ میں انتقال فرمایا تین دیوان شائع ہو چکے ہیں۔ کلام یہ ہے:۔

غزل (۱۶۲)

گُل افشانی کے دم بھرتی ہے چشمِ خوں فشاں کیا کیا
ہمارے زیب دامن ہے بہار گلستاں کیا کیا

فقط اک سادگی پر شوخیوں کے ہیں گماں کیا کیا
نگاہِ شرمگیں سے ہے نہاں کیا کیا عیاں کیا کیا

دلِ خوں گشتۂ حسرت نے کیا کیا گل کھلائے ہیں
بہار آگیں ہے کچھ ایسے برس فصلِ خزاں کیا کیا

جنوں سے کم نہیں ہے کچھ ہجوم شادمانی بھی
ہوائے گل میں ہے جامہ سے باہر باغباں کیا کیا

تصور میں وصال یار کے سامان ہوتے ہیں
نہیں بھی یاد ہیں حسرت کی بزم آرائیاں کیا کیا
چلی آتی ہے اترائی ہوئی کچھ کوئے جاناں سے
بسی ہے رشک کی بو میں نسیم بوستاں کیا کیا
قدم رکھتے نہیں ہیں وہ زمیں پر بے نیازی سے
بڑھا جاتا ہے یاں شوق سجود آستاں کیا کیا

ظہیر خستہ جاں سچ ہے محبت کچھ بُری شے ہے
مجازی میں حقیقی کے ہوئے ہیں امتحاں کیا کیا

(۱۶۳)

یہ رنگ اُلفت اگر نہ ہوتا تو کچھ خدائی میں کم نہ ہوتا
کسی پہ کوئی نہ جان دیتا کسی پہ جور و ستم نہ ہوتا
عدو جو شایانِ ظلم ہوتے تو لطف درد و الم نہ ہوتا
مزے محبت کے کون لیتا جو میں قتیل ستم نہ ہوتا
اگر نہ کرتے وہ کج ادائی تو کچھ عداوت سے کم نہ ہوتا
جو یہ نہ ہوتی تو کیا نہ ہوتا جفا نہ ہوتی ستم نہ ہوتا

غلط ہی شکوہ کہ وہ نہ آئے مجھے تو ہر طرح موت آتی
اگر وہ آتے تو جی نہ جاتا کہ فرطِ شادی سے دم نہ ہوتا

یہ ہئے اپنا ہی جی نہ چاہا وگرنہ خوفِ رقیب کیا تھا
کہ آپ آتے تو اڑ کے آتے زمیں پہ نقشِ قدم نہ ہوتا

غضب ہی شورش تپش قیامت سوا ہے دوزخ سے سوزِ الفت
وگرنہ جانِ حزیں پہ اتنا کبھی عذاب الم نہ ہوتا

اگر عدو پہ عذاب ہوتا نہ دل میں یوں پیچ و تاب ہوتا
جبیں پہ ہر دم شکن نہ پڑتی شکن سے ابرو میں خم نہ ہوتا

ظہیر ملتی نہ راہ ایماں جو کفر کرتا نہ رہنمائی
لبوں پہ یاد خدا نہ ہوتی جو دردِ ہجرِ صنم نہ ہوتا

(۶۹) آصف ۱۹۱۱ء

ہز ہائی نس میر محبوب علی خاں بہادر نظام الملک آصف جاہ سادس۔ آپ ۸ ہر اگست ۱۸۶۶ء کو پیدا ہوئے اور ۲۶ ر فروری ۱۸۶۹ء میں کچھ کم تین برس کی عمر میں باقاعدہ تخت نشیں ہوئے، انگریزی، عربی، فارسی سے بخوبی واقف تھے اور اکثر علوم سے علمی مذاق میں فردِ یگانہ تھے شکار کا نہایت شوق تھا شعر و سخن سے آپ کی

طبیعت کو خاص مناسبت تھی حضرت داغ دہلوی مرحوم اس فن میں مشورہ دیتے تھے شعر میں سلاست زبان و مضمون آفرینی کا لحاظ رکھتے تھے۔ تاریخ وفات ۲۹ اگست ۱۹۱۱ء مطابق ۱۳۲۹ھ ہے۔ دیوان غیر مطبوعہ ہے۔ کلام یہ ہے:۔

غزل (۱۶۴)

یہ دل آشنا اور نا آشنا ہے
نہیں ہے اگر تو ہمارا تو کیا ہے

پیو بھی پلاؤ بھی اس کا مزہ ہے
مزہ ہے یہی بات میں بات نکلے

نشانہ نہ دیکھے کو لنا دل
کریں بت کدہ سے عبث قصد کعبہ

کہاں جائے انسان ان سے نکل کر
شب وصل کس طرح طے ہو یہ جھگڑا

کہو پھر تو گھبرا کے ذکر عدو پر
یہ کافرسیں اک جگہ جمع ہوں گے

بہت دور ہے منزل دوست اے دل
کوئی بے وفاؤں کے دم میں نہ آئے

بھلوں سے بھلا اور بروں سے برا ہے
زمانہ میں کوئی کسی کا ہوا ہے

یہ شیشہ بھرا ہے یہ ساغر دھرا ہے
ادا سے ادا جب نہ ہو پھر تو کیا ہے

یہ تیر دعا ہے وہ تیر ادا ہے
یہاں بھی خدا ہے وہاں بھی خدا ہے

زمیں فتنہ گر ہے فلک فتنہ زا ہے
نہ تم مانتے ہو نہ دل مانتا ہے

نہیں ہم تو واقف خدا جانتا ہے
جہنم میں بھی اک طرح کا مزا ہے

جو یہ طے ہوئی پھر خدا ہی خدا ہے
محبت جو کی تھی یہ اس کی سزا ہے

	ہمارے بھی ہے امتحاں ہے آصف لگانا ہی دل کا سراسر غلط ہے	

(۷۰) تسلیم ۱۹۱۱ء

شیخ امیر اللہ خلف مولوی عبد الصمد صاحب فیض آبادی شاگرد رشید میرزا اصغر علی خاں نسیم دہلوی آپ ۱۸۲۳ء میں جبکہ غازی الدین حیدر مسند نشین ہوئے تھے پیدا ہوئے عرصۂ دراز تک لکھنؤ میں رہے وہاں کے مشاعروں میں شرکت کی اہل سخن سے صحبت گرم رہی اس کے بعد نواب کلب علی خاں بہادر کے عہد میں رام پور تشریف لائے اور مشاہیر شعرا میں اپنی بلند خیالی اور سخن سرائی کی داد پائی آپ کے دو دیوان اور مثنویات نالۂ تسلیم دل و جان صبح خندان طبع ہو چکی ہیں دور موجودہ کے شعرا میں نامور تھے ۱۹۱۱ء مطابق ۱۳۲۹ھ میں انتقال کیا۔

غزل (۱۶۵)

قیامت کی ہے بے تابی سرشک چشم گریاں میں
کبھی پہلوئے مژگاں میں کبھی آغوش داماں میں

دم طفلی سے ہیں ہوں آشنائے مرگ دوراں میں
فلک نے مجھ کو پالا دامن شمشیر عریاں میں

بنی ہی یہ میرے دم پر کہ میں پچھلے پہر آخر
اجل کو ڈھونڈھنے نکلا شب تاریک ہجراں میں

نظر کراے ستم گر ربطِ باہم اس کو کہتے ہیں
کہ پیکاں دل میں ہی دل نازبرداریِ پیکاں میں

ہوا ہیں زندۂ جاوید ہوکر قتل اے قاتل
بجھی بھی کیا تری شمشیر موجِ آبِ حیواں میں

جھکا دو شرم سے عالم دکھا کر قدِ موزوں کا
اُٹھایا ہی بہت سروِ سہی نے سر گلستاں میں

چلو گھر خاک بھی ڈالو حِنا کا خون ہوتا ہے
کفِ افسوس ملتے ہو کھڑے گنجِ شہیداں میں

حسینوں سے بگڑنا اور دل کو داغ دیتا ہی
بہت روئی زلیخا بھیجکر یوسف کو زنداں میں

ڈراتا کیوں ہی اے تسلیم واعظ مجھ کو دوزخ سے
مرا حصّہ نہیں ہی کیا خدا کے فضل و احساں میں

(۷۱) بیخود ۱۹۱۲ء

بیخود۔ مولوی عبدالحی۔ تخلص بیخود۔ خلف مولوی غلام سرور صدیقی بدایونی ۱۲۷۴ھ مطابق ۱۷؍ستمبر ۱۸۵۷ء کو بدایوں میں پیدا ہوئے۔ فارسی عربی سے بخوبی ماہر تھے دونوں زبانوں میں عمدہ استعداد رکھتے تھے۔ خوش رو۔ خوش لباس۔ زندہ دل۔ رنگین مزاج شاعر تھے۔ اساتذہ گزشتہ کے ذوق سخن سے آشنا ہو کر خود بھی معنی آفرینی کی طرف توجہ کرنے لگے۔ سب سے پہلے حضرت حالی مرحوم کے شاگرد ہوئے۔ آخر میں جناب داغ دہلوی کے ممتاز تلامذہ میں شامل ہوئے۔ ان کا کلام صفائی بیان اور جذبات سے مالامال ہے۔ پہلے شاہجہانپور میں وکالت کی آخر عمر میں ریاست جودھپور میں مجسٹریٹ تھے۔ نومبر ۱۹۱۲ء مطابق ۱۳۳۰ھ میں انتقال ہوا۔ بدایوں میں حضرت سید احمد رحمۃ اللہ علیہ کی درگاہ کے بیرونی چبوترہ پر دفن ہیں۔

کلام یہ ہے

(۶۶) غزل

درد دل میں کمی نہ ہو جائے	دوستی دشمنی نہ ہو جائے
کیسے ہو کوئی ہم کو دل کیوں دے	کہیں سچ مچ یہی نہ ہو جائے
تم مری دوستی کا دم نہ بھرو	آسماں مدعی نہ ہو جائے

کج ادائی تری ادا ٹھہری
میری نیکی بدی نہ ہوجائے

بیٹھنا ہی ہمیشہ رندوں میں
کہیں زاہد ولی نہ ہوجائے

طالع بد وہاں کبھی ساتھ نہ دے
موت بھی زندگی نہ ہوجائے

حسنِ بے حد کیوں اُٹھا رکھی
ہونے والی ابھی نہ ہوجائے

بھول جائیں نہ وہ جفا اپنی
یہ ہوئی آن ہوئی نہ ہوجائے

اپنی خوئے وفا سے ڈرتا ہوں
عاشقی بندگی نہ ہوجائے

کہیں بیخود تمھاری خودداری
مانعِ بے خودی نہ ہوجائے

(۱۹۷) قطعہ

ازل میں داد و دہش کا جو حکم عام ہوا
تو سب کو مال ضروری علی الحساب ملا

کسی کو عالمِ طفلی کا عیش اور آرام
کسی کو راحتِ عشرت بھرا شباب ملا

کسی نے دولتِ ارماں و آرزو پائی
کسی کو خلعتِ اندوہ و اضطراب ملا

کسی کے بانٹے میں قسمت سے شوخیاں آئیں
کسی کو شرم عنایت ہوئی حجاب ملا

کسی کی جان کو تکلیف انتظار ملی
کسی کے دل کو غمِ ہجر کا عذاب ملا

کسی کو پردہ نشینوں کا غم نصیب ہوا
کسی کو عشقِ رُخِ یارِ بے نقاب ملا

جو عاصیوں کے اشارے میں معصیت آئی
تو زاہدوں کو طریقِ رہِ صواب ملا

کسی کی بات نے اعجاز عیسوی پایا
کسی کو ذوق کباب جگر حصول ہوا
کسی نے عشوہ گرو گج نظر لقب پایا
کسی کے بخت نے پائی سپہر کی گردش
کسی کو عقل کسی کو تمیز ہاتھ آئی
ملا زمیں کو شرف جلوہ حسیناں سے
غرضکہ میں نے کیا جسقدر خیال اُس دن
مگر نصیب سے بیچو دہی وہ گیا محروم

کسی کے قلب کو آزار التہاب مِلا
کسی کو شوق قدح نوشی شراب مِلا
کسی کو بیچو دشور بدہ سر خطاب مِلا
کسی کے دل کو زمانے کا انقلاب مِلا
کسی کو ذہن ہزاروں میں انتخاب مِلا
فلک کو بحر ضیا نور آفتاب مِلا
ہر ایک اپنی مرادوں پہ کامیاب مِلا
نہ کچھ عذاب ہی پایا نہ کچھ ثواب مِلا

پھر اب کہو کہ ”دیا کیا“ کسی نے کچھ نہ دیا
پھر اب کہو کہ ”ملا کیا“ فقط جواب مِلا

(۷۲) اِحسان سنہ ۱۹۱۲ء

احسان منشی احسان علی خاں خلف منشی قاسم علیخاں آپ شاہجہانپور کے باشندے تھے سنہ ۱۲۷۴ھ مطابق سنہ ۱۸۵۸ء میں ولادت ہوئی حکیم سید ضامن علی جلال لکھنوی کے شاگردان رشید سے تھے۔ شاہجہانپور میں مختاری کا پیشہ کرتے تھے وہیں ایک اُردو ماہوار رسالہ ”ارمغان“ کے نام سے جاری کیا تھا جو عرصہ تک جاری رہا۔ جولائی سنہ ۱۹۱۲ء مطابق سنہ ۱۳۳۰ھ میں

وفات پائی۔ دیوان اور رسالہ "تشبیہ یار" آپ کی یادگار ہیں۔
کلام یہ ہے:۔

(۱۴۸) غزل

اس کو نہ سوچیے کہ ستم یا کرم ہوا
خنجر اٹھائیے سر تسلیم خم ہوا

توڑا ہمارے دل کو بتوں نے ستم ہوا
وہ بھی انھیں کا قول انھیں کی قسم ہوا

اپنی گلی میں دیکھ کے ہم ہو رہے ہیں خوش
نقشِ امید یار کا نقشِ قدم ہوا

کیسا مری وفا نے پشیمان کر دیا
آنکھیں بھی انکی جھک گئیں غصہ بھی کم ہوا

دونوں طرف ہی جب وہی دل ایک جان ایک
مجھ پر ستم ہوا تو تمھیں پر ستم ہوا

محرومِ عیش میری طرح دوسرا کہاں
دل میں سرورِ وصل بھی آیا تو غم ہوا

احسان ضبط کرنے سے خفائے راز عشق
دل سے بہت ہوا مگر آنکھوں سے کم ہوا

(۷۳) حالی ۱۹۱۴ء

حالی شمس العلماء خواجہ الطاف حسین خلف خواجہ ایزد بخش انصاری۔ مولد پانی پت ۱۸۳۷ء میں پیدا ہوئے۔ جوانی میں دہلی آ گئے تھے۔ ابتداءً حضرت شیفتہ سے کلام میں

اِصلاح لیتے تھے۔ بعدہٗ اُردو فارسی دونوں کلام مرزا غالب کو دکھانے لگے اور آپ کے ارشد تلامذہ میں داخل ہوئے چالیس[۴۰] پینتالیس[۴۵] سال کی عمر تک قدیم طرز میں غزل کہتے رہے۔ ۱۸۷۹ء میں جبکہ سر سید احمد خاں مرحوم مسلمانوں کو بیدار کرنے کے لئے ایک نئی روح پھونک رہے تھے اور مدرستہ العلوم علی گڈھ قایم ہوئے صرف چودہ[۱۴] سال گزرے تھے۔ حالی پر سر سید کی نظر پڑی اور وہ یہ کہہ اُٹھے :-

اں دل کہ رم نمودے از خوبرو جوانان

دیرینہ سال پیرے بردش بیک نگاہے

اُسی زمانہ میں اُنھوں نے سر سید کی تحریک سے مسدس "مد وجزر اسلام" لکھا جس میں مسلمانوں کو اُن کی گزشتہ اور موجودہ حالت کا نقشہ اس طرح دکھایا کہ سخت سے سخت دلوں میں تاثیر کی ایک بجلی دوڑ گئی۔ اُس مسدس کے شائع ہونے سے نہ صرف مسلمانوں میں ترقی کے جذبات پیدا ہوئے بلکہ اُردو نظم کی تاریخ میں قومی شاعری کی داغ بیل پڑ گئی۔ اس سے قبل اس قسم کی نظم اردو میں موجود نہ تھی۔ اور نہ اس وقت تک اس پایہ کی کوئی دلگداز قومی نظم اردو میں پائی جاتی ہے یہ وہی مسدس ہی جس کی نسبت سر سید نے مولانا حالی کو اپنے خط مورخہ ۱۰ر جون ۱۸۷۹ء میں لکھا تھا "بے شک میں اسکا محرک ہوا اور اسکو میں اپنے اعمال حسنہ میں سمجھتا ہوں جب خدا پوچھے گا کہ "تو کیا لایا"؟ میں کہوں گا کہ حالی سے مسدس لکھوا لایا ہوں اور کچھ نہیں" یہ مسدس مختلف مطابع میں لاکھوں کی تعداد میں چھپ چکا ہی ایک نفیس پاکٹ ایڈیشن ۱۹۰۹ء میں نامی پریس کانپور نے چھاپا تھا اس سے قبل اسی مطبع نے

ایسا ہی ایڈیشن رباعیات حالی کا بھی شایع کیا تھا جس کی ملک نے بہت قدر کی مولانا حالی کا درجہ نثر نگاری میں بھی کم نہ تھا۔ حیات جاوید۔ یادگار غالب وغیرہ اسکی شاہد ہیں۔ دیوان حالی مع ایک مبسوط مقدمہ کے ۱۸۹۳ء میں نامی پریس میں طبع ہوا ہے۔ ۳۰ر دسمبر ۱۹۱۴ء مطابق ۱۳۳۲ھ کو خواجہ صاحب کا انتقال ہو گیا۔

انتخاب مدوجزر اسلام

(۱۶۹) بعثت ختم المرسلین

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا — مُرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کی کام آنے والا — وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا

فقیروں کا ملجا ضعیفوں کا ماوے
یتیموں کا والی۔ غلاموں کا مولے

خطا کار سے درگزر کرنے والا — بد اندیش کے دل میں گھر کرنے والا
مفاسد کو زیر و زبر کرنے والا — قبائل کو شیر و شکر کرنے والا

اُتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

مس خاک کو جس نے کندن بنایا — کھرا اور کھوٹا الگ کر دکھایا
عرب جس پہ قرنوں سے تھا جہل چھایا — پلٹ دی بس اک آن میں اُس کی کایا

رہا ڈر نہ بیڑے کو موجِ بلا کا
اِدھر سے اُدھر پھر گیا رُخ ہوا کا

پڑی کان میں دھات تھی اک نکمّی — نہ کچھ قدر تھی اور نہ قیمت تھی جس کی
طبیعت میں جو اس کی جوہر تھے اصلی — ہوئے سب تھے مٹی میں مل کر وہ مٹی

یہ تھا ثبت علمِ قضا و قدر میں
کہ بن جائے گی وہ طلا اک نظر میں

وہ فخرِ عرب زیبِ محراب و منبر — تمام اہلِ مکّہ کو ہمراہ لے کر
گیا ایک دن حسبِ فرمانِ داور — سوئے دشت اور چڑھ کے کوہِ صفا پر

یہ فرمایا سب سے کہ اے آلِ غالب!
سمجھتے ہو تم مجھ کو صادق کہ کاذب"

کہا سب نے قول آج تک کوئی تیرا — کبھی ہم نے جھوٹا سنا اور نہ دیکھا
کہا "گر سمجھتے ہو تم مجھ کو ایسا — تو باور کرو گے اگر میں کہوں گا

کہ فوجِ گراں پشتِ کوہِ صفا پر
پڑی ہو کہ لوٹے تمہیں گھات پا کر"

کہا "تیری ہر بات کا یاں یقیں ہی — کہ بچپن سے صادق ہی اور تو امیں ہی
کہا "گر مری بات یہ دل نشیں ہی — تو سن لو خلاف اس میں اصلا نہیں ہی

کہ سب قافلہ یاں سے ہی جانے والا

ڈرو اُس سے جو وقت ہی آنے والا"

وہ بجلی کا کڑکا تھا۔ یا صوتِ ہادی
عرب کی زمیں جس نے ساری ہلا دی
نئی اک لگن سب کے دل میں لگا دی
اک آواز میں سوتی بستی جگا دی
پڑا ہر طرف غل یہ پیغامِ حق سے
کہ گونج اُٹھے دشت و جبل نامِ حق سے

(۱۷۰) خلافتِ اندلس

کوئی قرطبہ کے کھنڈر جا کے دیکھے
مساجد کے محراب و در جا کے دیکھے
حجازی امیروں کے گھر جا کے دیکھے
خلافت کو زیر و زبر جا کے دیکھے
جلال اُن کا کھنڈروں میں ہے یوں چمکتا
کہ ہو خاک میں جیسے کندن دمکتا

(۱۷۱) خلافتِ بغداد

وہ بلدہ کہ فخرِ بلادِ جہاں تھا
تر و خشک پر جس کا سکہ رواں تھا
گرا جس پہ عباسیوں کا نشاں تھا
عراقِ عرب جس سے رشکِ جناں تھا
اُڑا لے گئی بادِ پندار جس کو
بہا لے گئی سیلِ تاتار جس کو

سُنے گوشِ عبرت سے جا جا کے انساں — تو واں ذرہ ذرہ یہ کرتا ہے اعلاں
کہ تھا جن دنوں مہرِ اسلام تاباں — ہُوا یاں کی بھی زندگی بخش دوراں
پڑی خاکِ یثرب میں جاں یہیں سے
ہوا زندہ پھر نام یونان یہیں سے

وہ لقمان و سقراط کے دُرِّ مکنوں — وہ اسرارِ بقراط و درسِ فلاطوں
ارسطو کی تعلیم، سولن کے قانوں — پڑے تھے کسی قبرِ کہنہ میں مدفوں
یہیں آ کے مُہرِ سکوت اُن کی ٹوٹی
اسی باغِ رعنا سے بُو اُن کی پھوٹی

وہ تارے جو تھے شرق میں لمعہ افگن — پہ تھا اُن کی کرنوں سے تا غرب روشن
نوشتوں سے ہیں جن کے اب تک مزیّن — کتب خانۂ پیرس و روم و لندن
پڑا غلغلہ جن کا تھا کشوروں میں
وہ سوتے ہیں بغداد کے مقبروں میں

(۷۲) ملّتِ اسلامیہ اور دیگر اقوام و ملل

ملے کوئی ٹیلا اگر ایسا اونچا — کہ آتی ہو واں سے نظر ساری دنیا
چڑھے اُس پہ پھر اک خرد مند دانا — کہ قدرت کے دنگل کا دیکھے تماشا
تو قوموں میں فرق اس قدر پائے گا وہ

کہ عالم کو زیر و زبر پائے گا وہ

وہ دیکھے گا ہر سو ہزاروں چمن واں ۔ بہت تازہ تر صورتِ باغِ رضواں
بہت اُن سے کمتر، پہ سرسبز و خنداں ۔ بہت خشک اور بے طراوت مگر ہاں
نہیں لائے گو برگ و باراں کے پودے
نظر آتے ہیں ہونہار اُن کے پودے

پھر اک باغ دیکھے گا اُجڑا سراسر ۔ جہاں خاک اڑتی ہے ہر سو برابر
نہیں تازگی کا کہیں نام جس پر ۔ ہری ٹہنیاں جھڑ گئیں جس کی جل کر
نہیں پھول پھل جس میں آنے کے قابل
ہوئے روکھ جس کے جلانے کے قابل

جہاں آگ کا کام کرتا ہے باراں ۔ جہاں آ کے دیتا ہے رو ابرِ نیساں
تردّد سے جو اور ہوتا ہے ویراں ۔ نہیں راس جس کو خزاں اور بہاراں
یہ آوازِ پیہم وہاں آ رہی ہے
کہ اسلام کا باغ ویراں یہی ہے

وہ دینِ حجازی کا بیباک بیڑا ۔ نشاں جس کا اقصائے عالم میں پہنچا
مزاحم ہوا کوئی خطرہ نہ جس کا ۔ نہ عمّاں میں ٹھٹکا نہ قلزم میں جھجکا
کئے پے سپر جس نے ساتوں سمندر
وہ ڈوبا دہانے میں گنگا کے آکر

(۱۷۳) اُمید سے خطاب!

بس اے نا اُمیدی نہ یوں دل بجھا تو
ذرا نا امیدوں کی ڈھارس بندھا تو
جھلک اے امید اپنی آخر دکھا تو
فسردہ دلوں کے دل آخر بڑھا تو

ترے دَم سے مُردوں میں جانیں پڑی ہیں
جلی کھیتیاں تو نے سر سبز کی ہیں

سفینہ پئے نوح طوفاں میں تو تھی
زلیخا کی غمخوار ہجراں میں تو تھی
سکوں بخش یعقوب کنعاں میں تو تھی
دل آرام یوسف کی زنداں میں تو تھی

مصائب نے جب آن کر ان کو گھیرا
سہارا وہاں سب کو تھا ایک تیرا

بہت ڈوبتوں کو ترایا ہے تو نے
اُکھڑتے دلوں کو جمایا ہے تو نے
بگڑتوں کو اکثر بنایا ہے تو نے
اُجڑتے گھروں کو بسایا ہے تو نے

بہت تو نے پستوں کو بالا کیا ہے
اندھیرے میں اکثر اُجالا کیا ہے

قوی تجھ سے ہمت ہے پیر و جواں کی
تجھی پر ہے بنیاد نظمِ جہاں کی
بندھی تجھ سے ڈھارس ہے خورد و کلاں کی
نہ ہو تو۔ تو رونق نہ ہو اس جہاں کی

لگا پوٹ ہے ہر مرحلے میں تجھی سے
رَہِ ارَدہ ہی ہر قافلے میں تجھی سے

کسانوں سے کلّر میں تو ہی بوائی　　جہازوں کو گرداب میں ہی کھوائی
سکندر کو دارا پہ ہی تو چڑھائی　　فریدوں کو ضحاک سے ہی لڑائی

چلے سب جدھر تو نے مائل عناں کی
نظر تیری سیٹی پہ ہے کارواں کی

نوازا بہت بے نواؤں کو تو نے　　تونگر بنایا گداؤں کو تو نے
دیا دست رس نارساؤں کو تو نے　　کیا بادشہ ناخداؤں کو تو نے

سکندر کو شان کئی تو نے بخشی
کلمبس کو دنیا نئی تو نے بخشی

وہ رہ رو نہیں رکھتے جو کوئی ساماں　　خور و زاد سے جن کا خالی ہی داماں
نہ ساتھی کوئی جس سے منزل ہو آساں　　نہ محرم کوئی جو سُنے درد پنہاں

ترے بل پہ خوش خوش ہیں اس طرح جاتے
کہ جا کر خزانہ ہے اب کوئی پاتے

زمیں جوتنے کو جب اُٹھتا ہی جوتا　　سمیں کا گماں تک نہیں جب کہ ہوتا
شب و روز محنت میں ہے جان کھوتا　　مہینوں نہیں پاؤں پھیلا کے سوتا

اگر موجزن اُس کے دل میں نہ تو ہو
تو دنیا میں غل بھوک کا چار سو ہو

بنے اس سے بھی گر سوا اپنے دم پر　　بلاؤں کا ہو سامنا ہر قدم پر

پہاڑ اک فنز دل اور ہو کوہ غم پر　　گزرتی ہو جو کچھ گزر جائے ہم پر

نہیں فکر۔ تو دل بڑھاتی ہے جب تک
دماغوں میں تو تیری آتی ہے جب تک

یہ سچ ہے کہ حالت ہماری زبوں ہے　　عزیزوں کی غفلت وہی جوں کی توں ہے
جہالت وہی قوم کی رہنموں ہے　　تعصب کی گردن پہ ملت کا خوں ہے

مگر اے امید ایک سہارا ہے تیرا
کہ جلوہ یہ دنیا میں سارا ہے تیرا

قطعہ (۱۷۴)

ہوئی رلیاں جوانی کی بہار آخر حیف
اپنی روداد تھی جو عشق کا کرتے تھے بیاں
اب کہ الفت ہے نہ چاہت نہ جوانی نہ امنگ
گر غزل لکھیے تو کیا لکھیے غزل میں آخر
آپ بیتی نہ ہو جو ہے وہ کہانی بے لطف
ہاں مگر کیجیے کچھ عشق کا غیر دل سے بیاں
کھینچیے وصل صنم کی کبھی فرضی تصویر
تا کہ بھڑکائے جوانوں کے دل آتش کی طرح
پر یہ ڈر ہے کہ کہیں ہو نہ وہ ہادی وہ مثل

طبع رنگیں تھی مئے عشق کی جب متوالی
جو غزل لکھتے تھے ہوتی تھی سراسر حالی
نہ رہی سودا سے تھی عشق سے دل ہے خالی
نہ رہی چیز وہ مضمون سمجھانے والی
گرچہ ہوں لفظ فصیح اور زباں ٹکسالی
لائیے باغ سے اوروں کے لگا کر ڈالی
کیجیے درد جدائی کی کبھی نقالی
وہ ہوا جس سے دماغ اپنا ہوا ہے خالی
قحبہ چوں پیر شود پیشہ کند دلالی

(۱۷۵)

جیتے جی موت کے تم منہ میں نہ جانا ہرگز
دوستو! دل نہ لگانا، نہ لگانا ہرگز

عشق کی تاک میں بیٹھا ہے نظر بازوں کی
دیکھنا! شیر سے آنکھیں نہ لڑانا ہرگز

زال کی پہلی ہی رستم کو نصیحت یہ تھی
زد میں تیرِ صفِ مژگاں کی نہ جانا ہرگز

چاہت اک طلعتِ مکروہ ہے برقع میں نہاں
کسی رُولالہ کے دھوکے میں نہ آنا ہرگز

ہاتھ ملنے نہ ہوں پیری میں اگر حسرت سے
نوجوانی میں نہ یہ روگ بسانا ہرگز

جتنے رہنے تھے ترے ہو گئے ویراں اے عشق
آکے ویرانوں میں اب گھر نہ بسانا ہرگز

کوچ سب کر گئے دلی سے ترے قدر شناس
قدر یاں رہ کے اب اپنی نہ گنوانا ہرگز

تذکرہ دہلیِ مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ
نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانا ہرگز

داستاں گل کی خزاں میں نہ سنا اے بلبل
ہنستے ہنستے ہمیں ظالم نہ رلانا ہرگز

ڈھونڈتا ہے دلِ شوریدہ بہانے مطرب!
دردانگیز غزل کوئی نہ گانا ہرگز

صحبتیں اگلی مصور ہمیں یاد آئیں گی
کوئی دلچسپ مرقع نہ دکھانا ہرگز

موجزن دل میں ہیں یاں خون کے دریا اے چشم
دیکھنا! ابر سے آنکھیں نہ چرانا ہرگز

لے کے داغ آئے گا سینے پہ بہت اے سیاح
دیکھ! اس شہر کے کھنڈروں میں نہ جانا ہرگز

چپے چپے پہ ہیں یاں گوہرِ یکتا تہِ خاک
دفن ہوگا کہیں اتنا نہ خزانا ہرگز

مٹ گئے تیرے مٹانے کے نشاں بھی اب تو
اے فلک اس سے زیادہ نہ مٹانا ہرگز

وہ تو بھولے تھے ہمیں ہم بھی اُنھیں بھول گئے — ایسا بدلا ہے نہ بدلے گا زمانہ ہرگز
جسکو زخموں سے حوادث کے اچھوتا سمجھیں — نظر آتا نہیں ۔ ایک ایسا گھرانا ہرگز
ہم کو گر تو نے رُلایا تو رُلایا اے چرخ — ہم پہ غیروں کو تو ظالم نہ ہنسانا ہرگز
یار خود روئیں گے کیا۔ ان پہ جہاں رقا ہے — ان کی ہنستی ہوئی شکلوں پہ نہ جانا ہرگز
آخری دور میں بھی تجھ کو قسم ہے ساقی — بھر کے اک جام نہ پیاسوں کو پلانا ہرگز
بخت سوئے ہیں بہت جاگ کے اے دورِ زماں — نہ ابھی نیند کے ماتوں کو جگانا ہرگز
یاں سے رخصت ہو سویرے کہیں اے عشق و نشاط — نہیں اس دور میں یاں تیرا ٹھکانا ہرگز
کبھی اے علم و ہنر گھر تھا تمھارا دہلی — ہم کو بھولے ہو تو گھر بھول نہ جانا ہرگز
شاعری مر چکی اب زندہ رہو گی یارو — یاد کر کر کے اُسے جی نہ کڑھانا ہرگز
غالبؔ و شیفتہؔ و نیرؔ و آزردہؔ و ذوقؔ — اب دکھائے گا یہ شکلیں نہ زمانا ہرگز
مومنؔ و علویؔ و صہبائیؔ و ممنونؔ کے بعد — شعر کا نام نہ لے گا کوئی دانا ہرگز
کر دیا مر کے یگانوں نے یگانہ ہم کو — ورنہ یاں کوئی نہ تھا ہم میں یگانا ہرگز
داغؔ و مجروحؔ کو سن لو کہ پھر اس گلشن میں — نہ سنے گا کوئی بلبل کا ترانا ہرگز
رات آخر ہوئی اور بزم ہوئی زیر و زبر — اب نہ دیکھو گے کبھی لطف شبانا ہرگز

بزمِ ماتم تو نہیں بزمِ سخن ہے حالیؔ
یاں مناسب نہیں رو رو کے رُلانا ہرگز

(۱۷۶) قصیدہ عرض حال بجناب سرور کائنات صلعم

اے خاصۂ خاصانِ رسل وقتِ دعا ہی
اُمت پہ تری آکے عجب وقت پڑا ہی

جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے
پردیس میں وہ آج غریب الغربا ہی

جس دین کے مدعو تھے کبھی قیصر و کسریٰ
خود آج وہ مہمانِ سرائے فقرا ہی

وہ دین ہوئی بزمِ جہاں جس سے چراغاں
اب اس کی مجالس میں نہ بتّی نہ دیا ہی

جو دین کہ تھا شرک سے عالم کا نگہباں
اب اُس کا نگہبان اگر ہی تو خدا ہی

جو تفرقے اقوام کے آیا تھا مٹانے
اس دین میں خود تفرقہ اب آکے پڑا ہی

جس دین نے تھے غیروں کے دل آکے ملائے
اس دین میں خود بھائی سے اب بھائی جُدا ہی

جو دین کہ ہمدردِ بنی نوعِ بشر تھا
اب جنگ و جدل چار طرف اس میں بپا ہی

جس دین کا تھا فقر بھی اکسیر غنا بھی
اس دین میں اب فقر ہی باقی نہ غنا ہی

جو دین کہ گودوں میں پلا تھا حکما کی
وہ عرصۂ تیغِ جُہلا و سفہا ہی

جس دین کی حجت سے سب ادیان تھے مغلوب
اب معترض اس دین پہ ہر ہرزہ درا ہی

ہی دین ترا اب بھی وہی چشمۂ صافی
دینداروں میں پر آب ہی باقی نہ صفا ہی

عالم ہی سو بے عقل ہی جاہل ہی سو وحشی
منعم ہی سو مغرور ہے مُفلس سو گدا ہی

یاں راگ ہی دن رات تو واں رنگ شب و روز
یہ مجلسِ اعیان ہے وہ بزمِ شرفا ہی

چھوٹوں میں اطاعت ہی نہ شفقت ہی بڑوں میں
پیاروں میں محبت ہی نہ یاروں میں وفا ہی

دولت ہی نہ عزّت نہ فضیلت نہ ہنر ہی
اک دین ہی باقی سو وہ بے برگ و نوا ہی

ہی دین کی دولت سے بہا علم سے رونق
بے دولت و علم اس میں نہ رونق نہ بہا ہی

شاہد ہی اگر دین تو علم اس کا ہی زیور
زیور ہی اگر علم تو مال اس کی جلا ہی

جس قوم میں اور دین میں ہو علم نہ دولت
اس قوم کی اور دین کی پانی پہ بنا ہی

گو قوم میں تیری نہیں اب کوئی بڑائی
پر نام تری قوم کا یاں اب بھی بڑا ہی

ڈر ہی کہیں یہ نام بھی مٹ جائے نہ آخر
غارت اسے اے دورِ زماں میٹ رہا ہی

جس قصر کا تھا سر بہ فلک گنبدِ اقبال
ادبار کی اب گونج رہی اس میں صدا ہی

بیڑا تھا نہ جو بادِ مخالف سے خبردار
جو چلتی ہی اب چلتی خلاف اس کے ہوا ہی

وہ روشنیِ بام و درِ کشورِ اسلام
یاد آج تلک جس کی زمانے کو ضیا ہی

روشن نظر آتا نہیں واں کوئی چراغ آج
بجھنے کو ہی اب گر کوئی بجھنے سے بچا ہی

عشرت کدے آباد تھے جس قوم کے ہر سو
اس قوم کا اک ایک گھر اب بزمِ عزا ہی

چاؤش تھے للکارتے جن رہ گزروں میں
دن رات بلند ان میں فقیروں کی صدا ہی

وہ قوم کہ آفاق میں جو سر بہ فلک تھی
وہ یاد میں اسلاف کی اب رو بہ قفا ہی

جو قوم کہ مالک تھی علوم اور حکم کی
اب علم کا واں نام نہ حکمت کا پتہ ہی

کھوج ان کے کمالات کا لگتا ہی اب اتنا
گم دشت میں اک قافلہ بے طبل و درا ہی

بگڑی ہی کچھ ایسی کہ بنائے نہیں بنتی
ہی اس سے یہ ظاہر کہ یہی حکمِ قضا ہی

تھی آس تو تھا خوف بھی ہمراہ رجا کے
اب خوف ہی مدت سے دلوں میں نہ رجا ہی

جو کچھ ہیں وہ سب اپنے ہی ہاتھوں کے ہیں کرتو
ت دیکھے ہیں یہ دن اپنی ہی غفلت کی بدولت
کی زیب بدن سب نے ہی پوشاک کتاں کی
درکار ہیں یاں معرکے میں جوشن و خفتاں
دریائے پر آشوب ہے کہ اک راہ میں حائل
ملتی نہیں اک بوند بھی پانی کی جہاں مفت
یہاں نکلے ہیں سودے کو درم لیکے پرانے
فریاد ہے اے کشتیِ امت کے نگہباں
اے چشمۂ رحمت بابی انت و امی
جس قوم نے گھر اور وطن تجھ سے چھڑایا
صدمہ دُرِ دنداں کو ترے جن سے کہ پہونچا
کی تونے خطا عفو ہے اُن کینہ کشوں کی
سو بار ترا دیکھ کے عفو اور ترحم
جو بے ادبی کرتے تھے اشعار میں تیری
برتاؤ ترے جبکہ یہ اعدا سے ہیں اپنے
کر حق سے دعا امتِ مرحوم کے حق میں
اُمت میں تری نیک بھی ہیں بد بھی ہیں لیکن

شکوہ ہے زمانے کا نہ قسمت کا گلا ہے
سچ ہے کہ برے کام کا انجام برا ہے
اور برف میں ٹھنڈی ہوئی کشور کی ہوا ہے
اور دوش پہ بار دل کے وہی کہنہ ردا ہے
اور بیٹھ کے گھر ناؤ پہ یاں قصدِ شنا ہے
واں قافلہ سب گھر سے نکل دست چلا ہے
اور سکہ رواں شہر میں مدت سے نیا ہے
بیڑا یہ تباہی کے قریب آن لگا ہے
دنیا پہ ترا لطف سدا عام
جب تونے کیا نیک سلوک اُن سے کیا ہے
کی اُن کے لئے تونے بھلائی کی دعا ہے
کھانے میں جنھوں نے کہ تجھے زہر دیا ہے
ہر باغی و سرکش کا سر آخر کو جھکا ہے
منقول انھیں سے تری بس مدح و ثنا ہے
اعدا سے غلاموں کو کچھ امید سوا ہے
خطرے میں بہت جسکا جہاز آکے گھرا ہے
دلدادہ ترا ایک سے ایک ان میں سوا ہے

ایماں جسے کہتے ہیں عقیدے میں ہمارے
وہ تیری محبت تری عترت کی ولا ہے

ہر چند خلش دہر مخالف میں ترا نام
ہتھیار جوانوں کا ہے پیروں کا عصا ہے

جو خاک ترے در پہ ہے جاروب سے اُڑتی
وہ خاک ہمارے لئے داروئے شفا ہے

جو شہر ہوا تیری ولادت سے مشرف
اب تک وہی قبلہ تری اُمت کا رہا ہے

جس ملک نے پائی تری ہجرت سے سعادت
کعبہ سے کشش اس کی ہر اک دل میں سوا ہے

کل دیکھئے پیش آئے غلاموں کو ترے کیا
اب تک تو ترے نام پہ اک ایک فدا ہے

گر بد ہیں تو حق اپنا ہے کچھ تجھ پہ زیادہ
اخبار میں الطالح لی ہم نے سُنا ہے

ہم نیک ہیں یا بد ہیں پھر آخر ہیں تمھارے
نسبت بہت اچھی ہے اگر حال بُرا ہے

تدبیر سنبھلنے کی ہمارے نہیں کوئی
ہاں ایک دُعا تیری کہ مقبول خدا ہے

خود جاہ کے طالب ہیں نہ عزت کے ہیں خواہاں
پر فکر ترے دین کی عزت کی سدا ہے

گر دین کو جوکھوں نہیں ذلت سے ہماری
اُمت تری ہر حال میں راضی برضا ہے

عزت کی بہت دیکھ لیں دنیا میں بہاریں
اب دیکھ لیں یہ بھی کہ جو ذلت میں مزا ہے

ہاں حالی گستاخ نہ بڑھ حدِ ادب سے
باتوں سے ٹپکتا تری اب صاف گلا ہے

ہے یہ بھی خبر تجھ کو کہ ہے کون مخاطب
یہاں جنبشِ لب خارج از آہنگ خطا ہے

———— ⁘ ————

(۷۴) اوج ۱۹۱۷ء

اوج میرزا محمد جعفر خلف الرشید حضرت دبیر۔ عربی۔ فارسی کی اچھی استعداد تھی علم عروض میں کمال تھا اس فن میں آپ نے ایک رسالہ بھی تالیف کیا تھا۔ جو اردو کی دنیا میں نہایت مقبول ہوا۔ جعفری بیگم صاحبہ کے اوقاف سے ان کو مرثیہ خوانی کے صلہ میں ایکہزار روپیہ سالانہ ملتا تھا۔ بعض تعلقہ داران اودھ بھی قدردانی فرماتے تھے۔ اب اپنے باپ کے قابل فخر یادگار تھے سلام مرثیہ۔ رباعی سب کچھ کہتے تھے۔ مگر تمام اصناف سخن میں آپکے سلام مطبوع خلائق ہوئے ستر برس کی عمر پائی ۱۹۱۷ء مطابق ۱۳۳۵ھ میں انتقال کیا۔

کلام کا انتخاب یہ ہے:۔

(۱۷۷) سلام

خواہشیں دنیا کی بارِ دوشِ گردن ہو گئیں
رفتہ رفتہ منزلِ عقبیٰ کی رہزن ہو گئیں
یہ ہوا کیسی چلی اس ننگ نائے دہر میں
شہر جنگل ہو گئے۔ آبادیاں بن ہو گئیں
چل سوئے گورِ غریباں اے حریص مال و زر
دیکھ کتنی آرزوئیں نذرِ مدفن ہو گئیں

کیسی رنگا رنگ شکلیں ہونگی اے جوشِ بہار
مرٹ کے جو گلگونۂ رخسارِ گلشن ہوگئیں

کھل نہیں سکتی کبھی کیفیت بغض و حسد
میری آہیں پردۂ ناموس دشمن ہوگئیں

میرے نغموں نے جو پائی قلبِ گلشن میں جگہ
شاخِ گل پر بلبلیں بار نشیمن ہوگئیں

جب مرے نالے ہوئے قدِ صنوبر سے بلند
بلبلیں ساکت سر دیوارِ گلشن ہوگئیں

جامۂ ہستی ہوا صد چاک جب مثل سحر
زینتیں دنیا کی گردِ دامن ہوگئیں

ہو سکے عون و محمد سے نہ سر بر زرہ پوش
حق میں بیٹوں کے دعائیں ماں کی جوشن ہوگئیں

(۷۵) اسمٰعیل ۱۹۱۷ء

اسمٰعیل۔ مولانا محمد اسمٰعیل میرٹھ کے رہنے والے تھے ۱۸۴۲ء میں پیدا ہوئے گورنمنٹ سنٹرل نارمل اسکول آگرہ میں مدرس فارسی تھے جدید طرز کی نظم لکھنے والے شعرا میں

ممتاز تھے۔ اردو کے ساتھ فارسی بھی کہتے تھے اُردو مدارس کے ابتدائی درجوں میں اُنکی مُصنفہ کتابیں عرصے تک رائج رہیں۔ گورنمنٹ نے اُن کو "خان صاحب" کا خطاب دیا تھا۔ زبان کی سلاست مضامین کی سادگی سے کلام کو ایسی مقبولیت ہوئی ہو کہ بچوں کو اُن کے اشعار نوک زبان ہو جاتے ہیں کلیات اسمٰعیل نہایت اہتمام سے ۱۹۱۰ء میں چھپ چکی ہو یکم نومبر ۱۹۱۷ء مطابق ۱۳۳۶ھ کو انتقال ہوگیا۔

کلام کا انتخاب یہ ہو

(۱۷۸) غزل

جو بھلے برے کی اٹکل نہ مرا شعار ہوتا
نہ جزائے خیر پاتا۔ نہ گناہ گار ہوتا

مَے بیخودی کا ساقی! مجھے ایک جرعہ بس تھا
نہ کبھی نشہ اترتا۔ نہ کبھی خمار ہوتا

میں کبھی کا مر بھی رہتا نہ غمِ فراق سہتا
اگر اپنی زندگی کا مجھے اختیار ہوتا

یہ جو عشق دیاں سنا ہی یہ وہ بحرِ بیکراں ہو
نہ سنا کوئی سفینہ کبھی اس سے پار ہوتا

کبھی بھولا کر کسی سے نہ کرو سلوک ایسا
کہ جو تم سے کوئی کرتا تمھیں ناگوار ہوتا

ہی اس انجمن میں یکساں عدم و وجود میرا
کہ جو میں یہاں نہ ہوتا یہی کاروبار ہوتا

(۱۷۹)

مانع سہر گشتگی وہ سنگِ در ہونا نہیں
چھوڑنا سر کا علاجِ دردِ سر ہونا نہیں

جیتِ دنیا! ہائے عقبیٰ! منزلِ دلبر ہے دور
دل جو ان سینے میں ٹھٹکا طے سفر ہوتا نہیں

یاد اور امید کی دو وقت سے کٹ جاتے ہیں دن
ورنہ غم کھانے سے دنیا میں گزر ہوتا نہیں

دعوئ الفت ہے کچا جو نہ ہو دل میں تپش
بے حرارت تو کبھی پختہ ثمر ہوتا نہیں

خوفِ جاں سے نامہ بر جانے کی ہامی کیوں بھرے
رشک سے یاں اعتبارِ نامہ بر ہوتا نہیں

صدمۂ دل کوبِ فرقت امتحانِ عشق ہے
بے پسے ثمرہ کبھی منظورِ نظر ہوتا نہیں

ہے شعورِ ماسوا بھی اک حجابِ آگہی
بے خبر جب تک نہ ہو لے باخبر ہوتا نہیں

(۱۸۰) اچھے دنوں کی یاد

ایامِ وصال بھی تھے کیا دن
راتیں تھیں مراد مدعا دن

محسوس نہ تھا کہاں کٹی رات
معلوم نہ تھا کدھر گیا دن

کیا جلد گزر گئے وہ دن جیت!
ہوتا کوئی اور بھی سوا دن

تھی رات بہت دنوں سے اچھی
راتوں سے زیادہ خوب تھا دن

تھی بزمِ وصال۔ دن ہو یا رات
تھی دیدِ جمال شب ہو یا دن

دنیا میں بزرگ تھی وہی رات
تھا عمر میں بس وہی بڑا دن

ہر صبح عجب۔ شام نادر
ہر رات جدید۔ اور نیا دن

تھی دن کو خوشی کہ اب ہوئی رات
تھی شب کو مسرت اب ہوا دن

عالم کو زبس کہ ہے تغیر
رہتے نہیں ایک سے سدا دن

تھا خواب وخیال وہ زمانہ
بجلی ہوئی رات اور ہوا دن

دن رات ہی فغاں ہو لب پر
وہ رات رہی نہ وہ رہا دن
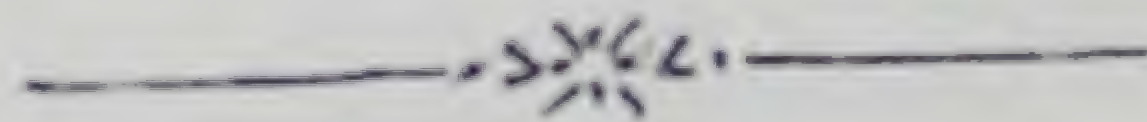
حصّۂ دوم

شعرائے حال کے کلام کا انتخاب

اِس حِصّہ میں اُن شعرا کو لیا گیا ہی جو بوقت ترتیب تذکرہ یعنی جولائی سنہ ۱۹۲۱ء تک زندہ تھے اُن کو بہ لحاظ تاریخ ولادت درج کیا گیا ہی لیکن نمبر سلسلہ دونوں حِصّوں کا ایک ہی رکھا گیا ہی

(۷۶) اکبر سنہ ۱۸۴۶ء

اکبر۔ خان بہادر مولوی سید اکبر حسین صاحب رضوی۔ دورِ موجودہ کے مشہور شاعر ہیں ۱۶ نومبر ۱۸۴۶ء مطابق ۱۲۶۲ھ کو الہ آباد میں پیدا ہوئے آپ کا سلسلۂ نسب حضرت امام موسیٰ رضا تک پہونچتا ہے شاعری کے پردہ میں درستی اخلاق خاص ان کا حصہ ہی کلام میں جدت بیشتر ہے لیکن ظرافت کو صحت زبان پر مقدم رکھتے ہیں انگریزی تعلیم یافتہ نوجوان ان کے کلام سے زیادہ فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ انگریزی الفاظ

اُردو میں کھپانے کی بہت کوشش کرتے ہیں۔ جدید محاورات جو انگریزی اختلاط سے اُردو میں پیدا ہوتے جاتے ہیں ان کے یہاں اشعار میں اکثر بندھے ہوئے ملیں گے حضرت وحید الٰہ آبادی شاگرد آتش سے تلمذ ہے دو دیوان شایع ہو چکے ہیں جو کلیات اکبر کے نام سے مطبوع خاص و عام ہیں صوبہ متحدہ میں جج رہے تھے ۱۹۰۵ء میں پنشن پائی ۱۸۹۸ء میں خان بہادری کا خطاب ملا

نمونہ کلام یہ ہے

غزل (۱۸۱)

یہ موجودہ طریقے راہی ملک عدم ہونگے
نئی تہذیب ہوگی اور نئے ساماں بہم ہونگے

نئے عنوان سے زینت دکھائینگے حسیں اپنی
نہ ایسا پیچ زلفوں میں نہ گیسو میں یہ خم ہونگے

نہ خاتونوں میں رہ جائیگی پردے کی یہ پابندی
نہ گھونگٹ اس طرح سے حاجب روئے صنم ہونگے

بدل جائیگا انداز طبائع دور گردوں سے
نئی صورت کی خوشیاں اور نئے اسباب غم ہونگے

نہ پیدا ہوگی خط نسخ سے شان ادب آگیں
نستعلیق حرف اس طرح سے زیب رقم ہونگے

خبر دیتی ہی تبدیل ہوا تحریک موسم کی
کھلینگے اور ہی گل زمزمے بلبل کے کم ہونگے

عقائد پر قیامت ڈھائیگی ترمیم ملت کی
نیا کعبہ بنیگا مغربی پتلے صنم ہونگے

بہت ہونگے مغنی نغمۂ تقلید یورپ کے
مگر بے جوڑ ہونگے اس لئے بےتال بہم ہونگے

ملا ۱ مں تذکرہ کی تالیف کے وقت خان بہادر صاحب بقید حیات تھے لیکن مطبع میں مسودہ بھیجے جانے کے بعد ۲ ستمبر ۱۹۲۱ء کو انتقال ہو گیا۔

ہماری اصطلاحوں سے زباں نا آشنا ہوگی
بدل جائیگا معیارِ شرافت چشمِ دنیا میں
گزشتہ عظمتوں کے تذکرے بھی بھول جائینگے
کسی کو اس تغیر کا نہ حس ہوگا، نہ غم ہوگا

لغاتِ مغربی بازار کی بھاکا سے ضم ہونگے
زیادہ تھے جو اپنے زعم میں وہ سب سے کم ہونگے
کتابوں ہی میں دفن افسانۂ جاہ و حشم ہونگے
ہوئے جس ساز سے پیدا اسی کے زیر بم ہونگے

تمھیں اس انقلاب دہر کا کیا غم ہے اے اکبرؔ
بہت نزدیک ہیں وہ دن نہ تم ہوگے نہ ہم ہونگے

(۷۷) شادؔ ۱۸۴۶ء

سید علی محمد نام ہے۔ سادات عظام سے ہیں۔ آپ کا سلسلۂ نسب ۲۴ واسطوں سے حضرت سیدنا امام زین العابدین سے ملتا ہے۔ سید حسین فیروزی بادشاہ عراق و فارس جن کا ذکر خواجہ حافظ شیرازی نے اپنے اس شعر میں کیا ہے۔ آپ کے اجداد میں تھے۔ ؎

راستی خاتم فیروزۂ بو اسحاقی
خوش درخشید ولے دولتِ مستعجل بود

۱۹ محرم ۱۲۶۲ھ مطابق جنوری ۱۸۴۶ء کو عظیم آباد پٹنہ میں پیدا ہوئے فارسی عربی میں کامل استعداد ہے (پنگل (عروض ہندی) سے بھی واقفیت ہے اپنے تصنیف کردہ اشعار کی تعداد مولانا نے خود ایک لاکھ سے چند ہزار زائد لکھی ہے۔ آپ کی تصانیف ہیں

"تاریخ صوبہ بہار" "مردم دیدہ" وغیرہ ہیں۔ ان کے علاوہ آپ نے حال میں ایک نئی کتاب "فکر بلیغ" لکھی ہے جس میں اردو کے تاریخی حالات میر انیس، دبیر، خلیق وغیرہ مشہور مرثیہ گو شعرا کے سوانح ان کے کلام سے انتخاب اور اس پر تنقید ہے۔ اس کی اشاعت سے اُردو ادب میں مفید اضافہ ہو گا۔ افسوس ہے کہ آپ کا کلام دیوان کی صورت میں ابتک شائع نہیں ہوا ۱۸۹۱ء میں گورنمنٹ سے خان بہادری کا خطاب پایا اور ۱۸۹۳ء میں پبلک نے ادبی خدمات کا اعتراف کر کے سید الشعراء کے لقب سے ممتاز کیا

کلام کا نمونہ یہ ہے

(۱۹۳) غزل

ہم سے نہ حق ادا ہو عشق کرشمہ ساز کا
شکوہ کریں تو کیا کریں جانِ بہانہ باز کا

ہجر میں اُف دل حزیں جو بہ اخیر دم ہوا
لب بھی ہلانا منع ہے مجھ سے امینِ راز کا

ہو گی جب اپنی آنکھ بند آئیگا وہ بھلا کبھی
دیکھ سکا نہ ہو سماں دیدۂ نیم باز کا

بوسۂ سنگِ آستاں لے نہ سکا ہزار حیف
آگے قدم نہ بڑھ سکا ہمت سرفراز کا

اے دل مضطرب ٹھہر وقت سوال بھی تو ہو
مجھ کو بھی نام یاد ہے اپنے گدا نواز کا

جلوۂ حسن کی طرف دیکھ تو کچھ پتا چلے
جانے دے ولولہ نہ پوچھ عاشق پاکباز کا

کشتۂ چشم رہ گیا کھول کے آنکھ اسی طرح
ذکر کسی نے کیوں کیا اُن کی نگاہِ ناز کا

پار لگائے گا وہی اپنی شکستہ ناؤ بھی
دل کو بنایا ناخدا جس نے مرے جہاز کا

اُن کے پیام کا جواب کس نے کہا کہ نالہ دے
کوئی علاج کیا کرے ایسے زباں دراز کا

قصۂ ہجر تاکجا تھک بھی چکی مری زباں
ہو بھی تو خاتمہ کہیں اس گلۂ فراز کا

پیرِ مغاں کے معجزے دیکھ چکے ہو واعظو
تم نہ پیو جو مے تو خیر حکم تو دو جواز کا

خاک بہت سی چھانکر دشت و جبل سے ہم پھر آئے
شاد پتا ملا نہ آہ قافلۂ حجاز کا

(۱۸۳)

آئی خزاں بہار کا موسم نکل گیا
کیوں اے نسیم تیرا کلیجہ نہ ہل گیا

اس باغ میں بہار خزاں کچھ نئی نہیں
دل کیا بدل گیا کہ زمانہ بدل گیا

قاصد مریضِ عشق سدھارا جہاں سے
اب کے پیامِ وصل کا جادو نہ چل گیا

(۱۸۴)

سہی کس نے ہی کون تیری سہے گا
نہ کوئی رہا ہے نہ کوئی رہے گا

ترا نام کیوں غیر لے میرے آگے
مرا دل بھی دل ہی کچھ آخر کہے گا

زمانے سے ہم تو گزر جائیں گے خود
زمانہ مگر آپ کو کیا کہے گا

یہ دنیا ہی ای شاد ناحق نہ الجھو
ہر اک کچھ تو اپنی سی آخر کہے گا

(۱۸۵)

غفلت میں ہوئے اوقات بسر ای عمر گریزاں کچھ نہ کیا
کی فکرِ وصال یار بہت لیکن سر و ساماں کچھ نہ کیا
جنبش سے تری مقتل ہوتا اک آن میں دشتِ کرب و بلا
عشاق کی بیباکی کے عوض ای ابروئے برّاں کچھ نہ کیا
اللہ نہ عراق و شام و حلب دُنیا نہ ہوئی ویران تو کیا
جل تھل نہ لہو سے تو نے بھرا تو خونِ مسلماں کچھ نہ کیا
ای ننگ جہاں ای شاد بنا کچھ آئی تجھ کو شرم و حیا
ای جہل مرکب ای حیوان اے بے خبر انساں کچھ نہ کیا

(۱۸۶)

وہ کیسی نعمت تھی ای محبت کہ جس نے ہر شخص کو مٹایا
نہ نیست ہونے کا جی میں کھٹکا نہ ہستی کا لطف کوئی پایا
نظر ہیں ویراں ہی بزم عالم بغیر دل کے یہ ہم نے پایا
جو دل پہ الزام ہو گیا کیوں ہمیں نے خود دیکھے کیا بنایا
اُمیدوار وہ بھی کس کی ای دل وصال ہی شے کی اف نہ کچھ کہہ
ہمیشہ دھوکے پہ کھائے دھوکے ہمیشہ رہ رہ کے آزمایا

کہاں یہ ریشِ سفید اپنی کہاں جوانوں کی بزم ساقی
بُرا ہو اس شوق کا الٰہی ہمیں بھی کافر لگا کے لایا

اُنھیں جو منظور دیکھنا ہو تو آکے ایسے ہیں دیکھ جائیں
لیا سنبھالا مریضِ غم نے چراغ رہ رہ کے جھلملایا

بناؤ لِللہ منصفی سے یہ تذکرہ کر رہا ہوں دل کا
یہی وفا کفی یہی مروّت کہ پھر کہ شامت زدہ نہ آیا

(۱۸۷)

اِدھر بھی کاش اک دن وہ سراپا ناز آ نکلے
کبھی ہم سے غرض ہو کے بھی دل کا حوصلہ نکلے

کہاں تاب و تواں کہ عمر کا ہجراں کشیدہ ہوں
نہ آسانی دم اپنا اپنے تن سے اے خدا نکلے

عدم میں آکے بھی خوف و رجا ہمراہ ہیں اپنے
ہنوز آلودہ ہیں نکلے بھی دنیا سے تو کیا نکلے

در و دیوار کی اُلفت نے بیخود کر دیا سب کو
ترے جہاں یہ مشکل تجھ سے اے جہاں ہم آ نکلے

عدو تک کی بھی خواہی ہے مقصود باطن ہیں
بظاہر ہو زباں پہ بد دعا دل سے دعا نکلے

چُھری چلتی ہے یارب انتظارِ قتل میں دل پہ
گھٹا جاتا ہے دم کب دیکھیے تیغِ قضا نکلے

وہ آنکھیں ہیں کہاں جن سے کھلے رازِ عالم کا
تماشا دیکھنے بیکار اس میلے کا آ نکلے

بلٹ کر پھر نہ پوچھا اللہ تو جینا ہے کہ مرنا ہے
وفا دارو! عدم میں جا کے تم بھی بے وفا نکلے

(۷۸) اثر ۱۸۴۹ء

اثر شمس العلماء جناب مولوی نواب سید امداد امام صاحب بہادر رئیس اعظم پٹنہ، ۹ اگست ۱۸۴۹ء کو آپ کی ولادت ہوئی۔ خاندان سادات کرام سے ہیں علوم مشرقی و مغربی میں کامل دستگاہ رکھتے تھے بالخصوص فن طبابت میں بہت زیادہ توغل ہے ۵۴ برس سے خلق خدا کی طبی خدمت کر رہے ہیں۔ آپ کی شاعری کا خاص رنگ ہے فطری جذبات محققانہ مسائل عاشقانہ واردات کو تغزل کے رنگ میں نبھانا آپ ہی کا حصہ ہے اس کے ساتھ ہی بلند پروازی کو جو غزل سرائی کی جان ہے ہاتھ سے نہیں جانے دیتے آپ کا دیوان چھپ چکا ہے شاعری کے فن میں آپ نے ایک کتاب "کاشف الحقائق" لکھی ہے جس میں مشہور شعرائے اردو کے کلام پر تنقید کی گئی ہے۔

(۱۸۸) غزل

یہی نہیں کہ دل کی دھڑکن رہے گی جبتک کہ جان ہے گی
یقین ہے اس کا کہ بعد مردن لحد بھی اپنی تپاں رہے گی

بہار عیش و نشاط کیسی، شگفتہ کیوں ہوں گل تمنا
ترے گلستاں میں بلبل دل خزاں رہی ہے خزاں رہے گی

شباب شاعر ہے عہد پیری کلام کا زور کم نہ ہوگا
رہے گی جبتک کہ جاں بدن میں طبیعت اپنی رواں رہے گی

وہ نعمتیں ہیں تری خدایا کہ وجد ہوتا ہی جن سے دل کو
رہے گی فرطِ ادب سے رقصاں دہن میں جبتک زباں رہے گی

چھپاؤں میں لاکھ سوزِ غم کو فغاں کا شعلہ بھڑک اُٹھے گا
دل و جگر جب اثرؔ جلیں گے یہ آگ کیوں کر نہاں رہے گی

(۱۸۹)

جفا پرور سے اُمید وفا کیا
عدو کے جور کا تجھ سے گلا کیا

غرض دلدادگی کی جانتے ہیں
کروں میں اُن سے عرضِ مدعا کیا

نہیں جب جوہر مردم شناسی
ستائش ہائے دشمن کا گلا کیا

سپاس طالعِ نیکو جو معنی
شکایت ہائے بختِ نارسا کیا

عدو شکر نہ چومے دستِ قاتل
دہانِ زخم شورِ مرحبا کیا

سراپا جلوۂ رنگِ وفا ہی
دل خوں گشتہ کے آگے حنا کیا

صبا آوارۂ و گل ندر صرصر
چمن کی ہوگئی اگلی ہوا کیا

فروغِ جلوۂ گل عارضی ہی
تماشائے بہار بے بقا کیا

عبث کرتی ہے بلبل ماتمِ گل
غمِ بربادیِ اہلِ فنا کیا

اثرؔ موہوم ہی مضمونِ ہستی
نہیں معلوم ہی کیا اور تھا کیا

(۱۹۰)

جفائیں ہوتی ہیں گھٹتا ہے دم ایسا بھی ہوتا ہے
مگر مجھ پر جو ہے تیرا ستم ایسا بھی ہوتا ہے

عدو کے آتے ہی رونق سدھاری تیری محفل کی
معاذ اللہ انساں کا قدم ایسا بھی ہوتا ہے

رکاوٹ ہی خلش ہی چھیڑ ہی ایذا پہ ایذا ہی
ستم اہلِ وفا پر دم بدم ایسا بھی ہوتا ہے

حسینوں کی جفائیں بھی تلوّن سے نہیں خالی
ستم کے بعد کرتے ہیں کرم ایسا بھی ہوتا ہے

نہ کر شکوہ ہماری بے سبب کی بدگمانی کا
محبت میں ترے سر کی قسم ایسا بھی ہوتا ہے

نہ ہو دردِ جدائی سے جو واقف اس کو کیا کہیے
ہمیں وہ دیکھ کر کہتے ہیں غم ایسا بھی ہوتا ہے

بتوں کے ملنے جلنے پر نہ جانا اے دلِ ناداں
بڑھا کر ربط کر دیتے ہیں کم ایسا بھی ہوتا ہے

ہمیں بزمِ عدو میں وہ بلاتے ہیں تمنا سے
کرم ایسا بھی ہوتا ہے ستم ایسا بھی ہوتا ہے

ہوا کرتا ہے سب کچھ اے اثرؔ اُس کی خدائی میں
کریں دعویٰ خدائی کا صنم ایسا بھی ہوتا ہے

(۱۹۱)

اے نو رسیدگانِ جوانی ذرا سنو!
اک دن وہ تھا کہ ساقیٔ مہوش تھا اپنے پاس
وہ بُت کہ دل کو حلقۂ دامِ بلا میں لائیں
آنکھوں کے سامنے سے الٰہی کدھر گئے
احباب بزم جتنے تھے سب ہو گئے ہوا

ملتا تھا لطف زیست ہمیں بھی شباب میں
پیتے تھے ہم شراب شب ماہتاب میں
زلفیں تھیں جن کی تا بہ کمر پیچ و تاب میں
اب تو نظر بھی آتے نہیں ہم کو خواب میں
گویا شراب پیتے تھے جام حباب میں

ہر لحظہ اُن کی یاد میں روئیں نہ کیوں اثرؔ
تصویریں اُن کی پھرتی ہیں چشمِ پُر آب میں

(۱۹۲)

سُنا حالِ دل پر کہا کچھ نہیں
مُقدّر میں جو تھا وہ تم نے کیا
شب ہجر ہوتا چلا میں فنا
نہ گُل پر ہے جوبن نہ بُلبل کو جوش

مگر کان دھر کر سُنا کچھ نہیں
تو تم سے ہم کو گلہ کچھ نہیں
سحر ہوتے ہوتے رہا کچھ نہیں
چمن کی وہ اگلی ہوا کچھ نہیں

عبادت خدا کی باُمید حور — مگر تجھ کو زاہد حیا کچھ نہیں
خدا اُن سے بندوں کو اپنے بچائے — کہ نزدیک جن کے خدا کچھ نہیں
حسینوں سے انداز مت پوچھئے — جفا ہی جفا ہے وفا کچھ نہیں

بتوں کی پرستش کہاں تک اثر
مگر تجھ کو خوفِ خدا کچھ نہیں

(۱۹۳)

اپنی نظروں میں چھپے خود رُخِ زیبا ہوکر — آپ کو دیکھتے ہیں آپ تماشا ہوکر
دیکھ ثابت قدمی اہل وفا کی اپنے — تیرے کوچہ میں رہے نقشِ کفِ پا ہوکر
اپنے مطلب کا ہوا کرتا ہی دیوانہ بھی — قیس صحرا کو گیا کوچہ لیلےٰ ہوکر
کیا ترا ساتھ ازل میں نہ ہوا تھا مجھ کو — میں نہ پہچانوں تجھے تیرا اشنا ہوکر
دشت میں ڈھونڈھنے جب قیس کو لیلیٰ نکلی — رہنما شوق ہوا جادۂ صحرا ہوکر
ایک جانب سے محبت نہیں باقی انجام — میں ترا ہو کے رہوں تو رہے میرا ہوکر
طور ہی طور رہی صحرائے طلب میں اپنے — ذرّہ ذرّہ اَرِنی کہتا ہی موسےٰ ہوکر
خضر و موسیٰ کی حکایت سے عیاں ہوتا ہی — جلوہ فرمائیاں کیں آپ نے کیا کیا ہوکر

آج کیوں صحبتِ احباب پہ مرتا ہی اثر
زیر مدفن تجھے کل رہنا ہی تنہا ہوکر

(۷۹) حافظ ۱۸۵۲ء

حافظ۔ قاضی خلیل الدین حسن ولد قاضی بشیر الدین احمد صاحب نقشی عبد الرحمانی پیلی بھیت کے شرفا میں ہیں اور وہیں وکالت کرتے ہیں۔ آنریری مجسٹریٹ بھی ہیں حافظ قرآن ہیں۔ دو مرتبہ حج کعبہ و زیارت روضۂ منورۂ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مشرف ہو چکے ہیں۔ ہندوستان کے نعت گو شعرا میں آپ کا کلام بہت مشہور ہو۔ اپنے ماموں قاضی ممتاز حسین صاحب ممتاز کے شاگرد ہیں۔ فارسی شعر گوئی کا بھی ملکہ ہو علم عروض و معانی و بیان پر عبور ہو نہایت ستھرا صاف اور پاکیزہ شعر کہتے ہیں۔ کلام کی تنقید اور شعر کے حسن و قبح سمجھنے میں خدا داد ملکہ ہو۔ وضع دار خوش اخلاق ہیں ۷۹ سال کی عمر ہے پانچ دیوان نعتیہ نظامی پریس بدایوں میں طبع ہو چکے ہیں چھٹا مرتب ہو۔ عاشقانہ شاعری چالیس برس سے ترک کر دی ہو۔ آپ کی تاریخ پیدائش ۲۴ رجون ۱۸۵۲ء مطابق ۵ رمضان ۱۲۶۸ھ ہو[1]۔ نمونہ کلام یہ ہے:-

(۱۹۴) رباعیات

دنیا تری قدرت کی تماشائی ہو — چھائی ہوئی سب پر تری یکتائی ہو
جلوہ ہو دوئی میں بھی تری وحدت کا — دو آنکھیں ہیں اور ایک بینائی ہو

[1] افسوس کہ ۶ رجب ۱۳۴۴ھ م ۹ دسمبر ۱۹۲۵ء کو انتقال ہو گیا۔

(۱۹۵)

دنیا سے ضرور کوچ کرنا اک روز
ہے سرحد ہستی سے گزرنا اک روز
جینے سے زیادہ قدر مرنے کی کرو
جینا ہے تمام عمر مرنا اک روز

(۱۹۶)

گوہر کو کرے جمع یہ جوہر ہے تو کیا
جب نفس غنی نہیں تونگر ہے تو کیا
جب جود نہیں، کرم نہیں فیض نہیں
مٹھی میں جو غنچے کی طرح زر ہے تو کیا

(۱۹۷) غزل

دل کو حسرت آئی تھی کوتاہی تقدیر پر
جنبش مژگاں سے چل کر تیر پہونچے تیر پر

دانہ دانہ کر گئے جب قسمت نے کی تقسیم رزق
نام دیوانوں کا لکھا دانۂ زنجیر پر

دل کے پردے میں وہ صورت ہے کہ چھپ سکتی نہیں
ایک آئینہ لگا ہے صاف اس تصویر پر

روتے روتے بندھ گئی ہچکی دم عرض سوال
اور پھندا پڑ گیا الجھی ہوئی تقریر پر

جب کوئی آئی مصیبت آئی دل کو تاکتی
جب کبھی ٹوٹی خرابی ٹوٹی اس تعمیر پر

کل ہم آئے آج رخصت صبر اب کس پر کریں
ہجر کی تعجیل پر یا موت کی تاخیر پر

ہند سے حافظ دوبارہ چل کے آیا ہے حضور
اک نظر ہو اس گدائے بے نوائے پیر پر

(۸۰) شوق ۱۸۵۳ء

شوق۔ شیخ احمد علی ولد کاظم علی قدوائی قصبہ جگور ضلع بارہ بنکی کے باشندے ہیں تقریباً ۱۸۵۳ء ان کا سال ولادت ہے۔ فن شعر میں حضرت امیر کے شاگرد ہیں۔ سادگی بے تکلفی اعلیٰ جذبات کے سوا اُردو کے محاورے نظم میں خوب کھپاتے ہیں۔ ان کی ابتدائی تعلیم بدایوں کے اسکول میں ہوئی۔ اس کے بعد ریاست رام پور میں طالب علمی کرتے رہے عرصہ ہوا کہ لکھنؤ میں آزاد نامی اخبار نکالا تھا اس کے بعد نواب گڑھ اور بھوپال میں ملازم رہے فی الحال ریاست رام پور میں ہیں اور دفتر حامد اللغات میں علمی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ڈراما "قاسم و زہرا" "مثنوی" "ترانۂ شوق" اور چند معنی خیز نظمیں ان کے افکار کا نتیجہ ہیں دیوان ہنوز شائع نہیں ہوا ہے[1]

کلام کا انتخاب یہ ہے:-

غزل (۱۹۸)

روح کو آج ناز ہے اپنا وقار دیکھ کر
اُس نے چڑھائیں تیوریاں میرا قرار دیکھ کر

قصد گلہ نہ تھا مگر حشر میں جوش شوق سے
ہاتھ مرا نہ رک سکا دامن یار دیکھ کر

[1] افسوس کہ اس وقت جبکہ اس تذکرہ کے طبع ثانی کی نوبت آئی شوق اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں آپکی تاریخ وفات ۲۰ اپریل ۱۹۲۵ء ہے۔ لیکن شکر ہے کہ ۱۹۲۶ء میں ان کا دیوان "فیضان شوق" شائع ہو گیا

دیکھ کے ایک بار اُنھیں دل سے تو ہاتھ دھو چکے	دیکھیے کیا گزرتی ہے دوسری بار دیکھ کر
آتے ہیں وہ تو پہلے ہی رنج سے صاف ہو رہوں	آگے کہیں پلٹ نہ جائیں دل میں غبار دیکھ کر
وصل سے گزرے اے خدا ہاں یہ شگون چاہیے	صبح کو ہم اُٹھا کریں روئے نگار دیکھ کر

کعبے کو جانہ شوقؔ ابھی ہے زندگی بخیر
ہم بھی چلیں گے تیرے ساتھ اگلی بہار دیکھ کر

(۸۱) منشی ۱۸۵۳ء

شیخ امیر علی ولد شیخ محمد حسین وطن قصبہ اکبر پور ضلع فیض آباد۔ مولد و مسکن لکھنؤ مفتی گنج پیدائش ۱۵ رصفر ۱۲۷۰ھ مطابق ۱۸۵۳ء نظیر علی تاریخی نام ہے۔ منشی تخلص ہے فارسی و عربی میں اچھی دستگاہ ہے لکھنؤ کے مشہور شعرا کی صحبتیں دیکھی ہیں کسی سے تلمذ نہیں فارسی میں بھی شعر کہتے ہیں کبھی کلام کے جمع کرنے کی طرف توجہ نہیں فرمائی۔ عرصہ ہوا آپ کا ایک قصیدہ موسومہ نیرنگ زنگار جس میں زمانے کا نقشہ کھینچا گیا ہے احباب کے اصرار سے چھپا تھا۔ ۴۴ برس سے ترک وطن کر دیا ہے سالہا سال تک بمبئی میں رہے آجکل حیدر آباد مقام ہے۔ کلام کا نمونہ یہ ہے۔

(۱۹۹) غزل

ذرا انصاف سے کہیے زحمت کسکی نہ نکلی	جفاؤں کے مقابل میں وفا تنہا اگر نکلی

اُبلنے کی جگہ طوفان عہدِ نوح کے آخر
تنور ہوگئے پردے میں میری چشمِ تر نکلی

حساب غم کیا سب اپنا اپنا پاک یاروں نے
یہ دیکھو خوبیٔ قسمت کہ باقی میرے سر نکلی

ہزاروں حسرتیں دل میں مرے مہمان بن بیٹھیں
نہ لائی تاب مہمانوں کی جاں اور چھوڑ گھر نکلی

(۲۰۰)

کیا حال پوچھتے ہو مجھ آشفتہ رنگ کا
سودائے زلف سر میں ہے اک شوخ و شنگ کا

پھیری نگاہِ ناز اس انداز خاص سے
جس سے پناہی چل نہ سکا صلح و جنگ کا

ان ہرزہ گوئیوں سے تو تسخیر پڑھو درود
سمجھے ہوئے ہو کیا یہ زمانہ اُمنگ کا

(۲۰۱)

شراب و ساقی و مطرب چھٹیں یہ ہو نہیں سکتا
سیہ نامہ مرا کیا ابر رحمت دھو نہیں سکتا

شہیدِ عشق ہوں گم گشتۂ وادیٔ الفت ہوں
کہو خضر و مسیحا سے کہ اب کچھ ہو نہیں سکتا

دلِ آشفتہ زلفِ پُر شکن کے پیچ میں آیا
قیامت تک تو پھندے سے نکلنا ہو نہیں سکتا

(۸۲) نظم ۱۸۵۵ء

نظم سید علی حیدر طبا طبائی لکھنؤ کے رہنے والے خاندان سادات سے طبا طبائی کی اولاد ہیں ہیں۔ مختلف مشرقی علوم میں مہارت رکھتے ہیں۔ فن شعر میں تحقیق کا درجہ حاصل ہے۔ شاعری میں کسی کے شاگرد نہیں ہیں۔ آپ سب سے پہلے کلکتہ میں واجد علی شاہ کے شہزادوں کو عربی تعلیم دینے کے واسطے مقرر کئے گئے تھے ۱۸۸۷ء میں واجد علی شاہ کا انتقال ہوجانے پر حیدرآباد دکن چلے آئے یہاں مختلف عہدوں پر ممتاز رہے نظام کالج کے عربی پروفیسر رہے ہیں حیدر جنگ کا خطاب پایا ہے۔ آپ نے دیوان غالب اردو کی ایک مبسوط شرح لکھی ہے جس میں شاعرانہ نکات اور فن سخن کے متعلق قابل قدر معلومات کو جمع کیا ہے۔ غزلیات کے علاوہ حالیہ نظمیں بھی لکھتے ہیں۔ دیوان کا انتخاب مولانا حسرت موہانی نے اردوئے معلےٰ پریس علی گڈھ سے شایع کیا ہے۔ ۳۰ محرم ۱۲۷۱ھ مطابق ۱۸۵۵ء تاریخ پیدایش ہے آپ علمی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے بعد ۱۹۳۳ء میں رحلت کر گئے۔ نمونہ کلام یہ ہے:۔

(۲۰۲) جوشِ گل

وہ موسم ہے کہ خوبانِ چمن بنتے سنورتے ہیں
ہے خوابیدہ جو سبزہ آئنہ خانے میں شبنم کے
پر طوطی پہ ہوتا ہے دمِ طاؤس کا دھوکا

یہ عالم ہے کہ جیسے رنگ چہرے پر دل میں نکھرتے ہیں
نفس دزدیدہ بادِ صبح کے جھونکے گزرتے ہیں
ہوا سے اُڑ کے برگِ گل جو سبزے پر بکھرتے ہیں

ملا ہی سبزۂ نوخیز کو کیا رنگ زنگاری
ہوا لگنے سے جسکی زخم دل لالے کے بھرتے ہیں

شگوفہ ریز ہو کر ڈالیاں مدہوش کرتی ہیں
کہ میکش جانتے ہیں طاق سے شیشے اترتے ہیں

نزاکت سے ادا سے جھوم کر کہتی ہی شاخ گل
یونہی اک جام پی کر رنگ مستوں کے نکھرتے ہیں

بشاشت کہہ رہی ہی چہرۂ گل کی ادھر دیکھو
یونہی محفل میں ہنس دیتے ہیں پیمانے جو بھرتے ہیں

چمن کی بڑھ کے شاخیں ایسے کرتی ہیں گلبازی
گلوں کی آئنہ داری پہ طاؤس کرتے ہیں

گماں ہوتا ہی کی لشکر کشی بادِ بہاری نے
زرہ پوش آ بچے جاتا ہی جب بادل گزرتے ہیں

دم صبح بہاری ہی رخ نو ریہ نقاب افگن
کسی آئینے پر تارِ نفس جیسے بکھرتے ہیں

وہیں جاکر تھمے گا کاروانِ لالہ و گل بھی
نسیمِ صبح کے جھونکے جہاں جاکر ٹھہرتے ہیں

نہالانِ چمن کرلیں گے قبضہ سارے عالم کا
وہاں سے پھر نہیں ہٹتے جہاں پہ پاؤں دھرتے ہیں

زمیں پر پاؤں پھیلایا ہی کوسوں تک سنبل نے
عنادل ان دنوں آتے ہوے گلشن میں ڈرتے ہیں

جوابِ جنتِ جم ہے گرمیِ ہنگامۂ گلشن
کہ لیکر کشتیِ مے تخت پریوں کے اترتے ہیں

عنادل مل چکے ہیں خاک میں جو کیا خبر ان کو
کہ شاخیں جھومتی ہیں پھول تربت پر بکھرتے ہیں

(۲۰۳)

ہنسی ہنسی میں وہ بات کہہ دی کہ رہ گئے آپ دنگ ہوکر
چھپا ہوا تھا جو راز دل میں کھلا وہ چہرے کا رنگ ہوکر

شباب پیری کا آنا جانا غضب کا پر درد ہے فسانہ
یہ رہ گئی بن کے گرد حسرت وہ اڑ گیا رخ سے رنگ ہوکر

جو راز دل سے زباں تک آیا تو اُس کو قابو میں پھر نہ پایا
زباں سے نکلا کلام بن کر، کماں سے چھوٹا خدنگ ہو کر
غضب ہی بحرِ فنا کا دھارا کہ مجھ کو اُلجھا کے پار اُتارا
نفس نے موجوں کا جال بن کر، لحد نے کام نہنگ ہو کر
جگر خراشی سے پائی فرصت نہ سینہ کاوی سے ناخنوں نے
گلا گریباں نے گھونٹ ڈالا جنوں کی شورش سے تنگ ہو کر
بدل کے دنیائے بھیس صدہا اُسے ڈرایا اُسے لبھایا
کبھی زنِ پیر زال بنکر، کبھی بتِ شوخ و شنگ ہو کر
اُٹھے تھے تلوار کھینچ کر تم تو پھر تامل نہ چاہیئے تھا
کہ رہ گئی میرے دل کی حسرت شہید تیغِ درنگ ہو کر
جو ولولے تھے وہ دب گئے سب ہجوم لیت و لعل میں حیدر
جو حوصلے تھے وہ دل ہی دل میں رہے دریغ دو رنگ ہو کر

(۲۴۰) گلاب کا پھول

قطعہ

گلگشتِ باغ میں نظر آیا یہ صبح دم	اک گل فرازِ شاخ چمن آشکار ہے
پوچھا یہ میں نے دیکھ کے اُسکا فروغ حسن	کس ناز میں کا تو چراغ مزار ہے

معلوم ہو رہا ہی گریبان کے چاک سے — شاید کسی کی خاک پہ تو سوگوار ہی

کہنے لگا کرے گی ماتم کسی کا کیا — اپنی ہی زیست کا نہیں کچھ اعتبار ہی

میں نے کہا ہمیشہ رہے یہ ترا شباب — کہنے لگا کہ چشم زدن کی بہار ہی

پوچھا یہ میں نے کان میں آتی ہی کیا صدا — بولا اجل اجل کی جہاں میں پکار ہے

پوچھا برنگ شعلہ تو لرزاں ہے کس لئے — بولا جگر میں زخم ہے پہلو میں خار ہی

میں نے کہا کہ زخم جگر کا ہی کیا سبب — کہنے لگا کہ تیغ قضا سے فگار ہی

میں نے کہا چھری یہ چھری کس گناہ پہ — اُس نے کہا مشیت پروردگار ہی

پوچھا یہ رو کے میں نے کچھ اسکا نہیں علاج — بولا یہ ہنس کے وہ مجھے کیا اختیار ہی

میں نے کہا کہ حیف تو کہنے لگا کہ حیف
جائے قرار ہی نہ تو پائے فرار ہی

(۸۳) شہیر ۱۸۵۶ء

شہیر سید محمد نوح خلف سید رعایت علی۔ آپ مچھلی شہر ضلع جونپور کے رئیس ہیں فن سخن میں حضرت منیر شکوہ آبادی سے تلمذ ہی فارسی عربی میں مناسب لیاقت ہی وکٹوریہ کالج اور آگرہ کالج میں انگریزی کی تعلیم پائی ہی۔ فرخ آباد کے مشاعروں میں شریک اور دونوں خواجہ بادشاہ سفیر خلف وزیر مرحوم کے ہمنشین رہے اور اُن سے بھی افادہ سخن حاصل کیا ہی

آپ کی تاریخ ولادت ۲۵ر دسمبر ۱۸۵۹ء مطابق ۱۲۷۶ھ ہی۔ نمونہ کلام یہ ہے:-

غزل (۲۰۵)

سرسبز پھر مرا شجرِ مدعا ہوا
آئی بہار زخمِ جگر پھر ہرا ہوا

سہرا اُسی کے سر ہو شہادت کا ان دنوں
تیرا شہیدِ ناز ہی دولھا بنا ہوا

تیرِ نگاہ دل سے جگر تک گزر گیا
آنکھوں نے انکی یہ بھی نہ جانا کہ کیا ہوا

ای بت خدا سے مانگوں میں کیونکر دعائے وصل
پتھر کے نیچے ہاتھ ہے میرا دبا ہوا

شاید عرق فشاں دمِ رفتار ہو وہ شوخ
فتنے کے عطر سے ہی زمانہ بسا ہوا

پہونچا دیا گلی میں تری جوشِ اشک نے
طوفان بہرِ کشتیِ دل ناخدا ہوا

کیا سبز ابرِ اشک سے ہو کشتِ آرزو
جب آج تک نہ سبزۂ مژگاں ہرا ہوا

تعقید اس غزل میں ہوئی کیونکر ای شہیر
دل زلف کی گرہ میں ہی شاید پھنسا ہوا

(۲۰۶)

شب بلا داغِ آتشیں سے بھی تیرگی میں کمی نہیں ہی
یہ کیسا اندھیر ہی مرے گھر کہ چاند ہی چاندنی نہیں ہی

جفائے معشوق کا گلہ کیا کہ امتحانِ وفا ہی اس میں
جو ہو محبّت کی آزمایش ۔ وہ داخل دشمنی نہیں ہی

جو دارِ منصور کا فسانہ سُنا تو جی کا تڑپ کا نپ اٹھا
کہ دل لگانا ہی جان جوکھوں یہ کچھ ہنسی دل لگی نہیں ہو

نہ جس سے کچھ مجھ کو نفع راحت ۔ نہ غیر کی جان کا ضرر کچھ
وہ دوستی دوستی نہیں ہو ۔ وہ دشمنی دشمنی نہیں ہو

بھڑک اُٹھے گی یہ آگ اک دن لگائی ہو جو دل و جگر میں
کہ اندر اندر سلگ رہی ہو ۔ دبی ہوئی ہو جلی نہیں ہو

یہی ہو دل سوزِ فرقت یہی ہو ہمدرد دردِ ہجراں
رہے سلامت اجل ہماری ۔ ہمیں غمِ بے کسی نہیں ہو

نہیں رہی ہائے وہ جوانی کہ جس سے تھا لطف زندگانی
شہیر پیری وبالِ جاں ہو ۔ کہ جان ہی زیست کی نہیں ہو

(۱۴۸) شاد ۱۸۶۲ء

شاد ۔ سر مہاراجہ بہادر کشن پرشاد یمین السلطنت پیشکار و سابق مدار المہام دکن آپ مہاراجہ چندو لال آنجہانی کے نواسے اور جانشین ہیں ۔ آپ کی ولادت ۱۸ ماہ جمادی الثانی ۱۲۷۹ھ بروز پنجشنبہ مطابق ۱۸۶۲ء عیسوی حیدرآباد میں ہوئی ۔ عربی ۔ فارسی ۔ انگریزی کے سوا

اور بھی چند زبانوں پر عبور ہے۔ اُردو فارسی اور بھاشا میں نظم و نثر قلم برداشتہ لکھتے ہیں
آپ کی طبیعت کا رجحان تصوّف کی طرف بہت بڑھا ہوا ہے۔ بزرگوں کی خدمت اور
کتب بینی نے آپ کے اس رنگ کو خوب پختہ کر دیا ہے۔ فن سخن سے خداداد مناسبت ہے
حضرت آصف غفراں مکان سے شرف تلمذ ہے طرز جدید و قدیم دونوں میں طبع آزمائی فرماتے ہیں
نظم و نثر کی متعدد تصانیف کے منجملہ آپ کا دیوان نعتیہ موسوم "بہ خمکدۂ رحمت" رباعیات شاد
کلام شاد۔ بزم خیال۔ بیاض شاد۔ مخزن القوافی وغیرہ شائع ہو چکی ہیں کلام میں سلاست
کا حصہ بہت زیادہ ہے جو آپ کی روانی طبع کا شاہد عادل ہے۔ کلام کو ہوا و ہوس کے اُن
شرمناک مضامین سے جن سے روحانیتِ شعر فنا ہو جاتی ہے آلودہ نہیں ہونے دیتے۔

نمونہ کلام یہ ہے:۔

غزل (۲۰۷)

بادۂ خمخانۂ توحید کا مے نوش ہوں
چُور ہوں مستی میں ایسا بیخود و مدہوش ہوں

گر بھر نہ دے مجھے ساقی یہ میرا فرض ہے
مثل ساغر دور میں بادۂ سرجوش ہوں

طرز خاموشی مری بتلاتی ہے اس راز کو
ہوں گنجِ حقیقت لاکھ میں خاموش ہوں

درد مند عشق ہوں نالہ کا خوگر ہوں میں
صورتِ سیماب ہوکر بیکیہ خاموش ہوں

کسکی فرقت وصل کس کا اور ہے معشوق کون
شاد میں اس عالمِ تکوین کا ہم آغوش ہوں

(۲۰۸)

اگر ظاہر نہ ہر صورت میں صورت آفریں ہوتا
پتا اسکا کہیں ملتا؛ نشاں اسکا کہیں ہوتا

تمہارے وصل کا بیشک یقیں ہوتا یقیں ہوتا
کسی تدبیر سے بھی تو گر خطِ جبیں ہوتا

کسی کا ہو کے رہنا یا کسی کو اپنا کر رکھنا
وہ تم سے ہو نہیں سکتا ہے یہ مجھ سے نہیں ہوتا

پلٹ کر دیکھ لینا جانے جاتے گر مرا قاتل
مجھے تجھ سے کبھی شکوہ ہی نگاہ روا نہیں ہوتا

نکلتا ناوکِ انداز گر نیچی نظر سے بھی
تو دل کے پار ہوتا گر نہ ہوتا دل نشیں ہوتا

جو وہ بے پردہ ہو جاتا کلیم اللہ کی خاطر
قیامت تھی قیامت کا تماشا پھر وہیں ہوتا

حسیں ہیں سیکڑوں لاکھوں میں کوئی اک آدھ ملتا ہے
محبت کا اثر ہر ایک کے دل پر نہیں ہوتا

اگر پردہ دوئی کا دور ہو جاتا نگاہوں سے
تو مجنوں کو نہ ہجرِ لیلیٰ محمل نشیں ہوتا

کہاں ممکن ہے صبر و عشق دونوں کا بہم ہونا
جو یہ ہوتا وہ نہیں ہوتا جو وہ ہو یہ نہیں ہوتا

نہ لیتا امتحاں وہ بت اگر شیخ و برہمن کا
لڑائی میں کسے پھر امتیازِ کفر و دیں ہوتا

ہو الاول ہو الآخر ہو الظاہر ہو الباطن
یہ ظاہر ہے مگر پھر بھی کہیں ظاہر نہیں ہوتا

عبادت کیلئے بھی شاد اطمینان لازم ہے
پریشانی میں کوئی کام ہو دل سے نہیں ہوتا

(۲۰۹)

اُس چشمِ سرمگیں سے ہیں سرمہ در گلو ہوں
دلمیں ہیں آرزوئیں خاموش گفتگو ہوں

اکسیر جائے نایاب آوارہ کو بکو ہوں
جسکی طلب ہے یا ہر دم سرگرمِ جستجو ہوں

غفلت ہے کس بلا کی اتنی خبر نہیں ہے
اپنا ہوں آپ عاشق معشوق بھی ہوں اپنا
دل میں نہیں سماتی ہے جوش پر ہے عشق
اقرب ہے شاہ رگ سے ہے دور ہر مکاں سے
ہوں بخت نارسا سے حیراں نصیب اپنا
دونوں جہاں ہیں مجھ میں نیرنگیاں ہیں مجھ میں
نغمے بھرے ہیں مجھ میں اسرار قدرتی کے
قاتل کی ٹھنڈی گرمی خنجر سے کوئی پوچھے

لکھا پایا ہے کس کو میں نے کیوں محو جستجو ہوں
کس کو طلب کروں اب اپنی میں آرزو ہوں
اس میکدہ میں ساقی لبریز اک سبو ہوں
ڈھونڈوں کہاں میں اس کو مایوس جستجو ہوں
پاتا نہیں ہوں اس کو گو محو جستجو ہوں
عالم کا ہوں تماشا عالم کی آرزو ہوں
تار نفس سے ہر دم اک ساز گفتگو ہوں
اب تاک لگ جہاں میں افسردہ بے لہو ہوں

ہے کون دوست میرا دشمن ہے کون میرا
ہوں دوست نا شناسا اپنا ہی میں عدو ہوں

(۸۵) بے نظیر سنہ ۱۸۶۳ء

سید محمد بے نظیر شاہ وارثی سال پیدائش سنہ ۱۲۸۰ھ مطابق سنہ ۱۸۶۳ء عیسوی عربی فارسی کے فاضل ہیں انگریزی بھی جانتے ہیں۔ علم طب بھی پڑھا ہے اس کے متعلق آپ کو جدید نباتات کی تحقیقات کا شوق ہے۔ اصلی وطن کٹرہ مانک پور ضلع الہ آباد ہے مدت سے حیدرآباد میں قیام ہے۔ فن شعر میں خاصی مہارت ہے۔۔ اردو غزل میں آپ مولانا

[1] سنہ ۱۹۲۹ء میں انتقال فرما گئے۔

وحید الہ آبادی مرحوم سے مشورہ لیتے تھے۔ قصیدہ اور مثنوی میں اکثر منشی امیر احمد مینائی سے اصلاح لی ہے۔ آپ کے کلام کا بہت بڑا حصہ ۱۸۹۵ء میں ایک سفر کے دوران میں گم ہو گیا ایک مثنوی الکلام جس میں جا بجا مناظر قدرت اور صحیح جذبات کی تصویریں کھینچی گئی ہیں ۱۳۱۰ھ میں نول کشور پریس میں طبع ہوئی ہے جس کا انتخاب ذیل میں دیا گیا ہے۔

غزل کا نمونہ یہ ہے:-

غزل (۲۱۰)

نہ رہا حجابِ نیاز بھی جو نگاہِ اہلِ نیاز میں
تو رہا نہ تیرے سوا کوئی پسِ پردۂ حسنِ مجاز میں

وہی عین ہے جو خیال ہے یہ مری حقیقتِ حال ہے
کہ شراب ہے دمِ مے کشی تو نماز ہوں میں نماز میں

نہ ہوا پہ آنکھ جو حسن ہے تو جہاں میں کوئی حسیں نہیں
جو وہ غزنوی کی نگاہ ہو تو ہی خم ہے زلفِ ایاز میں

یہ عجیب پردۂ حال ہے کہ نقاب حسنِ جمال ہے
جو نہاں بھی ہو کے عیاں ہے تو وہ راز ہے کوئی راز میں

یہ جہاں نہیں یہ ہے آئینہ ہے تصورِ ہمہ دا ہمہ
وہی جلوہ آئینہ ساز کا ہے نگاہِ آئینہ ساز میں

ہمہ تن تصورِ دیدہ ہوں طرب آشنائے نوید ہوں
کہ ترانہ کن ہے خموشیاں سحرِ دل کے پردۂ راز میں

مرے جرم کیا ہیں گناہ کیا تری شانِ لطف پہ میں فدا
کہ جلال ہے یا کبھی نہیں ترے عفوِ بندہ نواز میں

جو اسیرِ بندِ بلا ہوئے وہی قیدِ غم سے رہا ہوئے
وہ پھنسے رہے جو پھنسے نہ تھے ترے دامِ زلفِ دراز میں

تو چراغِ دیر و حرم رہے تجھے کیا پڑی ہے جو تو سنے
کہ تمام رات اسیر جلتی ہے کسی کے سوز و گداز میں

پسِ مرگ دادِ وفا ملی یہ مرادِ دستِ دعا ملی
کہ تری وفا نے اٹھا لیے مرے پھول دامنِ ناز میں

نہ عروج کچھ نہ نزول ہے یہ خیال و وہم و فضول ہے
تری شکل کھینچ کے رکھ دیا جو قلم قضا نے سبب یہ تھا
یہ نوا جو شعلہ فروز ہے یہ دھنیں جو سامعہ سوز ہیں
دل زار ہند میں کیوں ڈرے مجھے دفن کوئی کہیں کرے

جو بلند یا افتادہ نشیب ہیں وہی پستیاں ہیں فراز میں
کوئی نقش حسن نہیں رہا ہے کلک نقش طراز میں
مرے سینہ ہی کی آگ ہے ترے راگ ہیں مرے ساز میں
مری خاک ہی کی روح بھی ترے در پہ ہو گی حجاز میں

جو بنا یہاں ہی مٹ گیا جو مٹا یہاں وہی بن گیا
یہی ہے نظیرؔ رواج ہے رہِ عشق شعبدہ باز میں

(۲۱۱)

کیوں اس قدر جہاں کی خاطر پہ بار ہوں
داغوں سے رنج و یاس کے ہیں لالہ زار ہوں
کیا ہو گی اس غریب کی بربادی حیات
یوں اس گلی کی خاک میں ان کے مل گئے
برباد ہو کے بھی مجھے اچھی جگہ ملی
کرلینگی خود اسیر مری نغمہ سنجیاں
آنے ہیں بدلیوں کے دن اے شوق مبارک
کیا شے ہے دردِ عشق مجھے کچھ خبر نہیں
کیا کم یہ اجر حسرت دیدار کا ملا
یاد آ گئی وہ جنبش ابرو غضب ہوا

نہ فراق ہوں نہ ترا انتظار ہوں
اس پہ یہ داغ ہے تری آنکھوں میں خار ہوں
دعویٰ یہاں خزاں کو یہ ہے میں بہار ہوں
ہر ذرہ کہہ رہا ہے کہ میں اک مزار ہوں
دل سے ترے نکل نہ سکا وہ غبار ہوں
صیاد گر ہے ایک تو میں بھی ہزار ہوں
گھوڑے پہ میں ہوا کہ ابھی سے سوار ہوں
کچھ تو مگر ضرور ہے جو بے قرار ہوں
یہ بھی بہت ہے جو تری آنکھوں میں خار ہوں
ہر آرزو یہ کہتی ہے خنجر کی دھار ہوں

بے ہوش ہو رہا ہوں خیالِ نگار میں
اللہ ہی جو اب میں کبھی ہوشیار ہوں

چھایا ہی سارے باغ پہ رنگِ فغاں مرا
اس سے غرض نہیں کہ خزاں ہوں بہار ہوں

ساقی جو پی ہو غیر کے ہاتھوں سے تو حرام
رندی میں بھی یہ آن ہے پرہیزگار ہوں

دنیا سے اُٹھ گیا میں فقط اس خیال سے
ایسا نہ ہو کہ آپ کی خاطر پہ بار ہوں

جو مردہ آرزو کا وہ میرے ہی دل میں ہی
دنیا کی حسرتوں کا میں گویا مزار ہوں

اس آفتاب پر بھی یہ کہتی ہے کہکشاں
اُترا ہوا کسی کے گلے کا میں ہار ہوں

خود اپنے دل کی آگ سے جلتا ہوں رات دن
رونق ہوں باغِ دہر کی لیکن چنار ہوں

ساقی وہ آفتاب چھپا وہ اذاں ہوئی
دے جلد بھر کے جام کہ میں روزہ دار ہوں

زخمی تڑپ رہا ہوں مگر آہ بے نظیر
یہ بھی خبر نہیں کہ میں کس کا شکار ہوں

(۲۱۴)

نہ رہے اکیلے جنوں میں بھی یہ تلاشِ ہمسفری رہی
خرد و حواس جو چل بسے تو بلا سے بے خبری رہی

ہوئے خشک پھول چمن جلا کہیں نام کو نہ تری رہی
یہی اپنے زخم ہرے رہے یہی اپنی آنکھ بھری رہی

وہ تری گلی کی فضا نہیں کہ لحد سے مردے نکل گئے
یہ مری جبینِ نیاز تھی کہ جہاں دھری تھی دھری رہی

بڑی احتیاط طلب ہے یہ جو شرابِ ساغرِ دل میں ہے
جو چھلک گئی تو چھلک گئی جو بھری رہی تو بھری رہی

نہ کدورت اپنی وفا میں ہے نہ غبار اپنی صفا میں ہے
اسے جس قدر بھی کسا گیا یہ کسوٹیوں پہ کھری رہی

جو تمیزِ حال ہوا ہوئی۔ طلبِ سکوں بھی فنا ہوئی
نہ دماغ میں وہ جنوں رہا نہ خیال میں وہ پری رہی

وہ ملال تھا کہ نکل گیا وہ خیال تھا کہ بدل گیا
مرے شکوے اپنے کبھی نہ تھے جو طبیعت انکی بھری رہی

مری فردِ جرم کو دیکھ کر یہ خیال تھا کہ اٹھے نظر
یہی ایک شکلِ امید تھی وہی آج تک نظری رہی

تری تیغ بھی کوئی خضر تھی۔ یہ اثر جو چل کے دکھا گئی
کوئی پنکھڑی گلِ زخم کی ہوئی خشک بھی تو ہری رہی

رہے باخبر تو نہ یہ کھلا کہ مآل و غایتِ عشق کیا
ہوئے بے خبر تو خبر ہوئی کہ خبر سے بے خبری رہی

کوئی حشر تک بھی نہ لکھ سکا مرے کارِ بد تو بھلا ہوا
کہ قرار دادِ گناہ سے مری فردِ جرم بری رہی

تری چشمِ مست کی یاد تھی مری روح نزع میں شاد تھی

کہ شراب گو نہ میں پی سکا مرے سامنے تو دھری رہی

مجھے پاسِ وضع ضرور تھا یہ کمال عقل و شعور تھا

مری پردہ پوشی جنوں ۔ مری عشق پردہ ری رہی

تری خاکِ در مجھے مل گئی تو ہوس نہ دل میں رہی کوئی

نہ وہ کیمیا کی طلب رہی نہ طلب کی دربدری رہی

وہ ہزار در پے رکیں رہا وہ ہزار پردہ نشیں رہا

وہی بے نظیر حزیں رہا وہی اس کی جلوہ گری رہی

(۲۱۴)

اس جگہ آ گرے ہیں ہم ٹھوکریں کھاتے ہوئے
وہ نکل جاتے ہیں اکثر سر کو ٹھکراتے ہوئے

اتنی مدت تو جنوں میں بھی رہا پابند وضع
شرم آتی ہے مجھے اب ہوش میں آتے ہوئے

دیکھنا اُس سے نہ کہدے کوئی میرے منہ کی بات
یہ بھی کہدیتے ہیں مجھ کو یاد فرماتے ہوئے

کچھ نہ لایا ساتھ کوئی ۔ کچھ نہ کوئی لے گیا
دیکھ ڈالے سیکڑوں آتے ہوئے جاتے ہوئے

تیرے مجنوں اب چمن کی سیر کے بھوکے نہیں
مدتیں گزریں بیاباں کی ہوا کھاتے ہوئے

ہم نہ سمجھے تھے کہ بن جائے گی تیری جان پر
جب کہا تو کہا ظالم نے شرماتے ہوئے

تیغ کی قدر دانی دیکھنا ابرِ بہار
لے چلے میرا جنازہ پھول برساتے ہوئے

کر لئے پہلے تو ہم حلقے میں لاکھوں دل اسیر
اب الجھتے ہیں وہ کیوں زلفوں کو سلجھاتے ہوئے

اس لئے وہ پوچھتے ہیں ظلم اپنے بار بار
معذرت اپنی نہیں ہوتی ہی کامل ای اُمید

اس سفر میں ہر قدم پر دل گیا تو شنہ ہمیں
تنگ تھا میدانِ عالم ای جنوں تو کس لئے

اس قدر ناکامیوں کا خوف رہتا ہی کہ اب
آمد و شد میں جہاں کی فقط دو دم کا ہی فرق

رنج ہوتا ہی مجھے یہ قصّہ دہراتے ہوئے
دیر لگتی ہی وہاں کیا رحم فرماتے ہوئے

پہونچے منزل پر برابر ٹھوکریں کھاتے ہوئے
وسعتِ صحرا نہ دیکھی پاؤں پھیلاتے ہوئے

دل میں ڈرتا ہوں خیالِ آرزو لاتے ہوئے
ایک دم آتے ہوئے اور ایک دم جاتے ہوئے

مٹ گئے پامالیوں سے وہ بھی آخر ای تطہیر
کچھ نشاں تھے جنکی قبروں کے اُدھر جاتے ہوئے

(۲۱۴)

ترے رخ پہ جم کر نظر رہ گئی
اِدھر رہ گئی یا اُدھر رہ گئی

ازل میں ہر انجام لکھا گیا
نہ کچھ بھی رہا تو بھی سب کچھ رہا

کمی کر گئی کیوں نگاہِ عتاب
کبھی کہہ دیا تھا کہ مرتا ہوں میں

میں اُٹھنے کو اُٹھا تو اس بزم سے
کہا تم نے دھوکے سے باتیں پہ قسم

یہی ہم سے او فتنہ گر رہ گئی
وفا کی شکایت مگر رہ گئی

شبِ غم کی لیکن سحر رہ گئی
تری یاد دل میں مگر رہ گئی

پہونچ کر ستاں تا جگر رہ گئی
شکایت انھیں عمر بھر رہ گئی

طبیعت وہیں بیٹھ کر رہ گئی
تری بات ای چارہ گر رہ گئی

ادا سے وہ ٹھکرا کے چلتے ہوئے
قیامت مری جان پر رہ گئی

کھنسی دل میں تیری سناں ٹوٹ کر
یہ ظالم نہ رہتی مگر رہ گئی

مصیبت کو بھی داد دل جائے گی
مرے ساتھ کچھ دن اگر رہ گئی

کہاں جا کے ٹھنڈی ہوئی آہ گرم
پہونچکر قریب اثر رہ گئی

خدا جانے آنکھوں میں اب کیا رہا
نظر تو ترے بام پر رہ گئی

پھر آئی نہ غربت میں یاد وطن
وہ کم بخت بھی جا کے گھر رہ گئی

تری شام گیسو کی خوشبو کہاں
گلوں تک نسیم سحر رہ گئی

غنیمت ہی جس کو عداوت نہ ہو
محبت بس اب اس قدر رہ گئی

یہ کیا کم سزا ہے بلندی کی ہی
کہ جھک کر فلک کی کمر رہ گئی

چلا جب یہ کہکر پکارا اسے
یہ بات اور ہی نامہ بر رہ گئی

بلا ہی بلا تھی محبت تری
وہ قسمت سے میرے ہی سر رہ گئی

کوئی دم میں ہی ختم طول حیات
یہ منزل بہت مختصر رہ گئی

یہ کہتی ہی ہر داستان کہن
مسافر سدھارے خبر رہ گئی

کہاں عشق میں عقل کو یہ خبر
گئی کس قدر کس قدر رہ گئی

اٹھے ہو کے مایوس ہر در سے ہم
بس اب اک تری رہ گزر رہ گئی

بڑی خیر گزری کہ ہی ضبط آہ
انھیں ہوتے ہوتے خبر رہ گئی

نہ توڑا انھیں غیر سے بے نظیر
محبت میں اتنی کسر رہ گئی

اُنتخاب از مثنوی الکلام"

(۲۲۵) برسات کا سماں!!

جو سوکھی زمیں پر ترشح ہوا — نکلتی ہے بو سوندھی سوندھی سی کیا
گرجتے ہیں بادل چمکتی ہے برق — ہوا صحن کا صحن پانی میں غرق
گئی نیند اُچٹ پانی کے شور سے — بہے جاتی ہیں نالیاں زور سے
ٹپکتی ہے بنگلے کی وہ اولتی — کہ ہے تارِ سیمیں کی چلمن پڑی
ہوا زور سے چلتی ہے بار بار — پہنچتی ہے کمروں کے اندر پھوار
بنا ہے جو وہ ٹین کا سائبان — ہے اس وقت ارگن کا اس پر گماں
عجب لے سے پانی برستا ہے آج — کہ زاہد بھی مے کو ترستا ہے آج
چٹائیوں پہ کیا لطف نظارہ ہے — کہ جو بوند ہے ایک فوارہ ہے
صبا کے طمانچے جو کھاتے ہیں آج — تو پودے سروں کو جھکاتے ہیں آج
چلی آتی ہے بدلیوں کی قطار — ہوا کے ہیں گھوڑے پہ بادل سوار
دھواں دھار اس وقت چھایا ہے ابر — فلک پر سیہ مست آیا ہے ابر
اُٹھی شاخِ گُل سبزے کو چوم کر — برستی ہے کیا کیا گھٹا جھوم کر
ہیں آراستہ سبز پوشانِ باغ — ہوا غسل سے ہر شجر کو فراغ
یکایک جو کی بوند ٹھہری ہوا — نظر آتی ہے اور ہی کچھ فضا

(۲۱۶) صبح کے وقت طلوعِ آفتاب کا منظر

ہی کچھ دھوپ کا عکس کہسار پر
نئی اوس کی دھوپ کھونے لگی
پرندے زمیں پر اترنے لگے
اُڑے کھول کر فیاز و سر خاب پر
وہ کھیتوں میں چڑیاں بھی آنے لگیں
ہوا پھر وہی کاروبار جہاں
ہوا ہے ابھی تک نہیں کچھ غبار
مگر شہر میں یہ نہیں آب و تاب
بلندی پہ کچھ دھوپ آنے لگی
منڈیروں پہ کچھ کچھ جھلکنے لگی

شعاعیں چمکتی ہیں اشجار پر
ہوا بھی ذرا گرم ہونے لگی
ہرن کھل کے جنگل میں چرنے لگے
گرے مرغ آبی وہ تالاب پر
وہ چُن چُن کے دانے اُٹھانے لگیں
ہوئے لوگ مصروف کار جہاں
رطوبت لگی اُٹھنے بن کر بخار
کہ ٹیلوں کی ہے اوٹ میں آفتاب
وہ کلسوں پہ سونا چڑھانے لگی
اُٹھ کر وہ در پہ چمکنے لگی

(۸۶) ریاض ۱۸۶۳ء

ریاض منشی ریاض احمد خلف سید طفیل احمد خیر آبادی سابق ایڈیٹر ریاض الاخبار عاشقانہ معاملات رندانہ مضامین خوب ادا کرتے ہیں۔ امیر مینائی کے شاگردوں میں ممتاز ہیں

کلام میں شوخی کا پورا اندازہ ہی۔ کہنہ مشق ہیں۔ اب محمود آباد کی ریاست سے وظیفہ پاتے ہیں اپنے وطن خیرآباد میں مقیم ہیں۔ دیوان زیر طبع ہی۔ سال پیدائش تقریباً ۱۸۲۳ء مطابق ۱۲۳۸ھ ہی نمونہ کلام یہ ہی۔ (افسوس کہ ۱۹۳۳ء میں انتقال ہوگیا)

(۲۱۷) غزل

تربت ہماری دیدۂ حسرت چمن میں تھی محتاج چار پھولوں کی تربت چمن میں تھی

اجڑا جب آشیاں تو خزاں کیا بہار کیا تنکوں سے آشیاں کے محبت چمن میں تھی

چننا نہ پھول پاؤں کے کانٹے نکالنا اک جوش گل مجھے کہیں فرصت چمن میں تھی

صحرا کی دیکھ بھال بھی کچھ تھی مرے سپرد تنکے چنوں چمن کے یہ خدمت چمن میں تھی

گم لیکے کنج باغ میں بیٹھے تھے چھپ کے ہم بزم چمن سے دور یہ خلوت چمن میں تھی

صیاد گھر ترا مجھے جنت سہی "مگر" جنت سے بھی سوا مجھے راحت چمن میں تھی

چنگاریاں جو باغ میں پھیلی تھیں پھول تھے باد بہار کی یہ شرارت چمن میں تھی

قید چمن میں جان بھی نکلی نہ ضعف سے رکھی ہوا اب قفس میں جو طاقت چمن میں تھی

رہتا تھا ہم سے دور بہت شور باغباں آزادیوں کی سچی مسرت چمن میں تھی

سامان سب تھے آج خدا نے بچا لیا توبہ کے بعد کچھ مری نیت چمن میں تھی

کل ہم گئے تھے دیکھ کے آنسو ٹپک پڑے
بے شمع و گل ریاض کی تربت چمن میں تھی

(۸۷) مضطر ۱۸۶۵ء

مضطر خیر آبادی۔ سید افتخار حسین ولد مولانا سید حافظ احمد حسین رضوی ۱۲۸۲ھ مطابق ۱۸۶۵ء کو پیدا ہوئے۔ تاریخ پیدائش لفظ "افتخار" سے نکلتی ہی۔ آپ شمس العلماء مولانا محمد عبد الحق صاحب منطقی کے حقیقی بھانجے ہیں عربی۔ فارسی کی تعلیم اپنی والدہ ماجدہ سے حاصل کی جو اپنے زمانے کی لائق ادیبہ تھیں فن شعر میں حضرت امیر مینائی سے تلمذ ہی۔ طبیعت حاضر پائی ہے۔ بہت زود گو ہیں نواب صاحب ٹونک کے استاد ہیں افتخار الشعرا کا خطاب حاصل ہی۔ اب ریاست گوالیار میں ملازم ہیں ایک دیوان "نذر خدا" جو توحید میں ہی چھپ گیا ہی ۶۳ سال کی عمر میں ۱۷ رمضان ۱۳۴۵ھ کو انتقال ہو گیا۔ قلعہ گوالیار کے پہلو میں مزار جھنگا شاہ کے قریب دفن ہوئے۔

نمونہ کلام یہ ہے:۔

(۲۱۸) غزل

سچ یہ ہی کہ ہیں کون متاعِ دل و دیں کا
وہ آپ ہی مالک ہیں یہ سب کچھ ہی انھیں کا

چھانا ہی جگر میری دعاؤں نے فلک کا
پیسا ہی کلیجا مرے نالوں نے زمیں کا

دن رات تمنا ہمیں کچھ کچھ ہی کسی کی
دن رات تصور ہمیں کچھ کچھ ہی کہیں کا

وہ وصل کی خواہش پہ یہ منہ دیکھ کے بولے
لکھا تو مٹا ڈال خطِ لوحِ جبیں کا

کھویا مرے جینے کا مزہ موت نے مضطر
اللہ کرے صبر پڑے جانِ حزیں کا

(۸۸) جلیل ۱۸۶۹ء

جلیل۔ حافظ جلیل حسن ابن مولوی حافظ عبدالکریم صاحب مانک پور ضلع الہ آباد کے رہنے والے اکیاسی سال کے قریب عمر ہے۔ سال ولادت تقریباً ۱۸۶۹ء مطابق ۱۲۸۶ ہجری بیس سال کی عمر میں حضرت امیر مینائی کے بمقام رام پور شاگرد ہوئے بتمام و کمال فیض اُنھیں سے حاصل کیا۔ اب ان کے جانشین کہلاتے ہیں۔ امیر اللغات کے دفتر میں عرصہ تک سکریٹری رہ چکے ہیں۔ حیدر آباد میں بھی منشی صاحب کے ہمراہ تھے اسوقت سرکار نظام کے سلسلۂ ملازمت میں داخل ہیں۔ نواب فصاحت جنگ کے خطاب سے سرفراز ہیں۔ دو دیوان شائع ہو چکے ہیں۔ کلام کا نمونہ یہ ہے۔

(۲۱۹) غزل

حسن و الفت میں خدا نے ربط پیدا کر دیا	دردِ دل مجھ کو دیا۔ تم کو مسیحا کر دیا
خوب کی تقسیم تو نے اے خیالِ زلفِ یار	دل کو نذرِ داغ سر کو وقف سودا کر دیا
جان لے لینا چلانا کھیل ہے معشوق کا	آنکھ سے مارا لبِ نازک سے زندہ کر دیا
مجھ کو شکوہ ہے کہ دل کا خون قاتل نے کیا	دل یہ کہتا ہے مجھے قطرے سے دریا کر دیا
ناز ہو یا دلبری افسوں ہو یا جادوگری	سبکو قدرت نے تری چتون کا حصہ کر دیا

دل ادھر رخصت ہوا ہوش اُسطرف چلتے ہوئے
کس کی آنکھوں نے یہ در پردہ اشارہ کر دیا

ہیں کہاں لغزش کہاں یہ سب کرشمے دیکھے ہیں
تم یہ خود شیدا ہوا تجھ کو بھی شیدا کر دیا

مرحبا اے ساقیِ جادو نظر صد مرحبا
مست آنکھوں نے مرا نشہ دوبالا کر دیا

ہم نہ ایسا جانتے تھے تیری چشمِ شوخ کو
فتنے برپا کرتے کرتے حشر برپا کر دیا

دل تڑپتا ہے تو کچھ تسکین ہوتی ہے جلیل
جی بہلنے کو خدا نے درد پیدا کر دیا

(٢٢٠)

درد دل لاکھ کہو اُن پہ اثر کچھ بھی نہیں
دل میں رہتے ہیں مگر دل کی خبر کچھ بھی نہیں

دیکھنے کو تو سبھی رکھتے ہیں آنکھیں لیکن
تو نظر آئے نہ جسکو وہ نظر کچھ بھی نہیں

کیا محبت وہی دو دو دل میں ہوا کرتی ہے
اسطرف جان پہ آفت ہے اُدھر کچھ بھی نہیں

شمع اس فکر سے محفل میں گھلی جاتی ہے
رات بھر کا ہے سماں وقت سحر کچھ بھی نہیں

ہو چکی دیدۂ گریاں کی گہر افشانی
اب تو دامن میں بجز لختِ جگر کچھ بھی نہیں

آ چکی ہے شبِ فرقت میں قیامت تو یار
اور ابھی خیر سے آثار سحر کچھ بھی نہیں

یاس ہوتی ترے ملنے سے تو بہتر ہوتا
نخلِ اُمید سے اُمیدِ ثمر کچھ بھی نہیں

کوئے جاناں میں یہ جانے کا نتیجہ ہے جلیل
کھو گئے ہوش کچھ ایسے کہ خبر کچھ بھی نہیں

(۸۹) اقبال ۱۸۷۶ء

اقبال، شیخ محمد اقبال ایم۔اے ۱۸۷۶ء مطابق ۱۲۹۳ھ میں اپنے وطن سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ طرز جدید کے شعرا میں ناموری پیدا کی۔ فارسی میں اعلیٰ درجہ کی استعداد رکھتے ہیں عربی اور سنسکرت میں بھی کسی قدر دخل ہی۔ انگریزی میں ایم۔اے پاس ہیں تعلیم انگلستان اور جرمنی میں پائی۔ آپ کو ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری بھی مل چکی ہی۔ لاہور میں بیرسٹرایٹ لا ہیں شاعری کا شغل بھی جاری رہتا ہی غلو تخییل اور بلند پروازِ فکر ان کی شاعری کا سب سے بڑا وصف ہی ان کا کلام رموزِ فطرت اور مناظرِ قدرت سے ان کی محبت کا پتا دیتا ہی۔ ان کا یہ ترانہ ملک بھر میں مشہور ہی۔ ڈاکٹر صاحب کو سر کا خطاب بھی مل گیا ہی۔ (۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو انتقال ہوا) نمونہ کلام یہ ہے:-

(۲۲۱) ترانہ

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم وطن ہی سارا جہاں ہمارا

دنیا کے بت کدوں میں پہلا وہ گھر خدا کا
ہم اس کے پاسباں ہیں وہ پاسباں ہمارا

تیغوں کے سایہ میں ہم پل کر جواں ہوئے ہیں
خنجر ہلال کا ہے قومی نشاں ہمارا

توحید کی امانت سینوں میں ہی ہمارے
ممکن نہیں مٹانا نام ونشاں ہمارا

باطل سے دبنے والے اے آسماں نہیں ہم
سو بار کر چکا ہے تو امتحاں ہمارا

اے ارضِ پاک تیری حرمت پہ کٹ مرے ہم
ہے خوں تری رگوں میں اب تک رواں ہمارا

مغرب کی وادیوں میں گونجی اذاں ہماری
تھمتا نہ کسی سے سیلِ رواں ہمارا

اے موجِ دجلہ تو بھی پہچانتی ہے ہم کو
اب تک ہے تیرا دریا افسانہ خواں ہمارا

اے گلستانِ اندلس وہ دن ہیں یاد تجھ کو
تھا تیری ڈالیوں میں جب آشیاں ہمارا

سالارِ کارواں ہے میرِ حجاز اپنا
اس نام سے ہے باقی آرامِ جاں ہمارا

اقبال کا ترانہ بانگِ درا ہے گویا
ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا

(۲۲۲)

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

غربت میں ہم اگر ہوں رہتا ہے دل وطن میں
سمجھو وہیں ہمیں بھی دل ہو جہاں ہمارا

پربت وہ سب سے اونچا ہمسایہ آسماں کا
وہ سنتری ہمارا وہ پاسباں ہمارا

مذہب نہیں سکھاتا۔ آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

یونان و مصر روما سب مٹ گئے جہاں سے اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری صدیوں رہا ہے دشمن دورِ جہاں ہمارا
اقبال کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں معلوم کیا کسی کو دردِ نہاں ہمارا
(۲۲۳)
کبھی اے حقیقتِ منتظر۔ نظر آ لباسِ مجاز میں کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں نہ کہیں جہاں میں اماں ملی جو اماں ملی تو کہاں ملی مرے جرم ہائے سیاہ کو۔ ترے عفوِ بندہ نواز میں نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں۔ نہ وہ حسن میں رہیں شوخیاں نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی نہ وہ خم ہے زلفِ ایاز میں تجھے کیا بتائیے ہم نشیں ہمیں موت میں جو مزا ملا نہ ملا مسیح و خضر کو بھی وہ نشاطِ عمرِ دراز میں نہ بچا بچا کے تو رکھ اسے ترا آئنہ ہے وہ آئنہ جو شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئنہ ساز میں

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا وصلِ دیدارِ یار ہوگا
سکوت تھا پردہ دار جس کا وہ راز اب آشکار ہوگا

نہیں رہا اب وہ دورِ ساقی کہ چھپ کے پیتے تھے پینے والے
جہان سارا بنے گا میخانہ ہر کوئی بادہ خوار ہوگا

سفینۂ برگِ گل بنا لے گا۔ کارواں مُورِ ناتواں کا
ہزار موجوں کی ہو کشاکش مگر یہ دریا کے پار ہوگا

کبھی جو آوارۂ جنوں تھے وہ بستیوں میں پھر آبسیں گے
برہنہ پائی وہی رہے گی مگر نیا خار زار ہوگا

چمن میں لالہ دکھاتا پھرتا ہے داغ اپنا کلی کلی کو
وہ یہ سمجھتا ہے اس دکھاوے سے دل جلوں میں شمار ہوگا

نہ پوچھ اقبال کا ٹھکانا ابھی وہی کیفیت ہے اس کی کہیں سرِ رہ گزار بیٹھا ستم کشِ انتظار ہوگا

(۲۲۵)

نہ سلیقہ مجھ میں کلیم کا۔ نہ قرینہ تجھ میں خلیل کا
میں ہلاکِ جادوئے سامری تو قتیلِ شیوۂ آزری

میں نوائے سوختہ در گلو۔ تو پریدہ رنگ رمیدہ بو
میں حکایتِ غمِ آرزو۔ تو حدیثِ ماتمِ دلبری

مرا عیشِ غم ۔ مرا شہدِ سم ۔ مری بود ہم نفسِ عدم
ترا دل حرم ۔ گروِ عجم ۔ ترا دین خریدۂ کافری
تری راکھ میں ہے اگر شرر تو خیالِ فقر و غنا نہ کر
کہ جہاں میں نانِ شعیر پر ہے مدارِ قوتِ حیدری
کوئی ایسی طرزِ طواف تو مجھے اے چراغِ حرم بتا
کہ ترے پتنگ کو پھر عطا ہو وہی سرشتِ سمندری
گلۂ جفائے وفا نما کہ حرم کو اہلِ حرم سے ہے
کسی بتکدے میں بیاں کروں تو کہے صنم بھی "ہری ہری"
کرم اے شہِ عرب و عجم کہ کھڑے ہیں منتظرِ کرم
وہ گدا کہ تو نے عطا کیا ہے جنھیں دماغِ سکندری

(٢٢٦) شکوہ

کیوں زیاں کار بنوں سود فراموش رہوں
فکرِ فردا نہ کروں محوِ غمِ دوش رہوں
نالے بلبل کے سنوں اور ہمہ تن گوش رہوں
ہم نوا میں بھی کوئی گل ہوں کہ خاموش رہوں

جرأت آموز مری تابِ سخن ہے مجھ کو
شکوہ اللہ سے خاکم بدہن ہے مجھ کو

ہے بجا شیوۂ تسلیم میں مشہور ہیں ہم
قصۂ درد سناتے ہیں کہ مجبور ہیں ہم
سازِ خاموش ہیں فریاد سے معمور ہیں ہم
نالہ آتا ہے اگر لب پہ تو معذور ہیں ہم

ای خدا شکوۂ اربابِ وفا بھی سن لے
خوگرِ حمد سے تھوڑا سا گلا بھی سن لے

تھی تو موجود ازل سے ہی تری ذاتِ قدیم
پھول تھا زیبِ چمن پر نہ پریشاں تھی شمیم
شرطِ انصاف ہے ای صاحبِ الطافِ عمیم
بوئے گل پھیلتی کس طرح جو ہوتی نہ نسیم

ہم کو جمعیتِ خاطر یہ پریشانی تھی
ورنہ اُمت ترے محبوب کی دیوانی تھی

ہم سے پہلے تھا عجب تیرے جہاں کا منظر
کہیں مسجود تھے پتھر کہیں معبود شجر
خوگرِ پیکرِ محسوس تھی انساں کی نظر
مانتا پھر کوئی ان دیکھے خدا کو کیونکر

تجھ کو معلوم ہے لیتا تھا کوئی نام ترا؟
قوتِ بازوئے مسلم نے کیا کام ترا

بس رہے تھے یہیں سلجوق بھی تورانی بھی
اہلِ چیں چین میں ایران میں ساسانی بھی
اسی معمورے میں آباد تھے یونانی بھی
اسی دنیا میں یہودی بھی تھے نصرانی بھی

پر ترے نام پہ تلوار اُٹھائی کس نے
بات جو بگڑی ہوئی تھی وہ بنائی کس نے

تھے ہمیں ایک ترے معرکہ آراؤں میں
خشکیوں میں کبھی لڑتے کبھی دریاؤں میں
دیں اذانیں کبھی یورپ کے کلیساؤں میں
کبھی افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں

شان آنکھوں میں نہ جچتی تھی جہانداروں کی

کلمہ پڑھتے تھے ہم چھاؤں میں تلواروں کی

ہم جو جیتے تھے تو جنگوں کی مصیبت کیلئے
اور مرتے تھے ترے نام کی عظمت کیلئے
تھی نہ کچھ تیغزنی اپنی حکومت کیلئے
سر بکف پھرتے تھے کیا دہر میں دولت کیلئے

قوم اپنی جو زر و مالِ جہاں پر مرتی
بُت فروشی کے عوض بُت شکنی کیوں کرتی

ٹل نہ سکتے تھے اگر جنگ میں اَڑ جاتے تھے
پاؤں شیروں کے بھی میداں سے اُکھڑ جاتے تھے
تجھ سے سرکش ہوا کوئی تو بگڑ جاتے تھے
تیغ کیا چیز ہے ہم توپ سے لڑ جاتے تھے

نقش توحید کا ہر دل پہ بٹھایا ہم نے
زیرِ خنجر بھی یہ پیغام سنایا ہم نے

تو ہی کہدے کہ اکھاڑا درِ خیبر کس نے
شہر قیصر کا جو تھا اس کو کیا سر کس نے
توڑے مخلوق خداوندوں کے پیکر کس نے
کاٹ کر رکھدیے کفار کے لشکر کس نے

کس نے ٹھنڈا کیا آتشکدۂ ایران کو
کس نے پھر زندہ کیا تذکرۂ یزداں کو

کونسی قوم فقط تیری طلبگار ہوئی
اور تیرے لئے زحمت کشِ پیکار ہوئی؟
کس کی شمشیر جہانگیر جہاندار ہوئی
کس کی تکبیر سے دُنیا تری بیدار ہوئی؟

کسکی ہیبت سے صنم سہمے ہوئے رہتے تھے
منہ کے بل گر کے ہو اللہ احد کہتے تھے

آگیا عین لڑائی میں اگر وقتِ نماز
قبلہ رو ہو کے زمیں بوس ہوئی قومِ حجاز
ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز
بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے
تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

محفل کون و مکاں میں سحر و شام پھرے
مئے توحید کو لے کر صفتِ جام پھرے
کوہ میں دشت میں لیکر ترا پیغام پھرے
اور معلوم ہے تجھ کو کبھی ناکام پھرے
دشت تو دشت ہیں دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحرِ ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے

صفحۂ دہر سے باطل کو مٹایا ہم نے
نوعِ انساں کو غلامی سے چھڑایا ہم نے
تیرے کعبے کو جبینوں سے بسایا ہم نے
تیرے قرآن کو سینوں سے لگایا ہم نے
پھر بھی ہم سے یہ گلا ہے کہ وفادار نہیں
ہم وفادار نہیں تو بھی تو دلدار نہیں

امتیں اور بھی ہیں ان میں گنہگار بھی ہیں
عجز والے بھی ہیں مستِ مئے پندار بھی ہیں
ان میں کاہل بھی ہیں غافل بھی ہیں ہشیار بھی ہیں
سیکڑوں ہیں کہ ترے نام سے بیزار بھی ہیں
رحمتیں ہیں تری اغیار کے کاشانوں پر
برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر

بت صنم خانوں میں کہتے ہیں مسلمان گئے
ہے خوشی ان کو کہ کعبے کے نگہبان گئے

منزلِ دہر سے اونٹوں کے حدی خوان گئے
اپنی بغلوں میں دبائے ہوئے قرآن گئے

خندہ زن کفر ہے۔ احساس تجھے ہے کہ نہیں
اپنی توحید کا کچھ پاس تجھے ہے کہ نہیں

یہ شکایت نہیں، ہیں ان کے خزانے معمور
نہیں محفل میں جنھیں بات بھی کرنے کا شعور

قہر تو یہ ہے کہ کافر کو ملیں حور و قصور
اور بیچارے مسلماں کو فقط وعدۂ حور

اب وہ الطاف نہیں ہم پہ عنایات نہیں
بات یہ کیا ہے؟ کہ پہلی سی مدارات نہیں

کیوں مسلمانوں میں ہے دولتِ دنیا نایاب
تیری قدرت تو ہے وہ جس کی نہ حد ہے نہ حساب

تو جو چاہے تو اٹھے سینۂ صحرا سے حباب
رہروِ دشت ہو سیلی زدۂ موجِ سراب

طعنِ اغیار ہے۔ رسوائی و ناداری ہے
کیا ترے نام پہ مرنے کا عوض خواری ہے

بنی اغیار کی اب چاہنے والی دنیا
رہ گئی اپنے لیے ایک خیالی دنیا

ہم تو رخصت ہوئے اوروں نے سنبھالی دنیا
پھر نہ کہنا ہوئی توحید سے خالی دنیا

ہم تو جیتے ہیں کہ دنیا میں ترا نام رہے
کہیں ممکن ہے کہ ساقی نہ رہے جام رہے

تیری محفل بھی گئی چاہنے والے بھی گئے
شب کی آہیں بھی گئیں صبح کے نالے بھی گئے

دل تجھے دے بھی گئے اپنا صلہ لے بھی گئے
آ کے بیٹھے بھی نہ تھے اور نکالے بھی گئے

آئے عشاق گئے وعدۂ فردا لیکر
اب اُنھیں ڈھونڈ چراغِ رخِ زیبا لیکر

درد لیلیٰ بھی وہی قیس کا پہلو بھی وہی
نجد کے دشت و جبل میں رم آہو بھی وہی
عشق کا دل بھی وہی حُسن کا جادو بھی وہی
اُمتِ احمدِ مرسل بھی وہی تو بھی وہی

پھر یہ آزردگیِ غیر سبب کیا معنی ؟
اپنے شیداؤں پہ یہ چشمِ غضب کیا معنی !

تجھ کو چھوڑا کہ رسول عربی کو چھوڑا
بُت گری پیشہ کیا۔ بُت شکنی کو چھوڑا
عشق کو عشق کی آشفتہ سری کو چھوڑا
رسمِ سلمان و اویسِ قرنی کو چھوڑا

آگ تکبیر کی سینوں میں دبی رکھتے ہیں
زندگی مثلِ بلالِ حبشی رکھتے ہیں

عشق کی خیر، وہ پہلی سی ادا بھی نہ سہی
جادہ پیمائیِ تسلیم و رضا بھی نہ سہی
مضطرب دل صفتِ قبلہ نما بھی نہ سہی
اور پابندیِ آئینِ وفا بھی نہ سہی

کبھی ہم سے کبھی غیروں سے شناسائی ہے
بات کہنے کی نہیں، تو بھی تو ہرجائی ہے

سرِ فاراں پہ کیا دین کو کامل تو نے
اک اشارے میں ہزاروں کے لئے دل تو نے
آتش اندوز کیا عشق کا حاصل تو نے
پھونک دی گرمیِ رخسار سے محفل تو نے

آج کیوں سینے ہمارے شرر آباد نہیں ؟

ہم وہی سوختہ ساماں ہیں تجھے یاد نہیں ؟

وادیٔ نجد میں وہ شورِ سلاسل نہ رہا
حوصلے وہ نہ رہے ہم نہ رہے دل نہ رہا

قیس دیوانۂ نظارۂ محمل نہ رہا
گھر یہ اجڑا ہے کہ تو رونقِ محفل نہ رہا

اے خوش آں روز کہ آئی و بصد ناز آئی
بے حجابانہ سوئے محفلِ ما باز آئی

بادہ کش غیر ہیں گلشن میں لبِ جو بیٹھے
دور ہنگامۂ گلزار سے یکسو بیٹھے

سنتے ہیں جام بہ کف نغمۂ کوکو بیٹھے
تیرے دیوانے بھی ہیں منتظرِ ہو بیٹھے

پھر پتنگوں کو مذاقِ تپش اندوزی دے
برقِ دیرینہ کو فرمانِ جگر سوزی دے

قومِ آوارہ عناں تاب ہے پھر سوئے حجاز
مضطرب باغ کے ہر غنچے میں ہے بوئے نیاز

لے اڑا بلبلِ بے پر کو مذاقِ پرواز
تو ذرا چھیڑ تو دے تشنۂ مضراب ہے ساز

نغمے بے تاب ہیں تاروں سے نکلنے کے لیے
طور مضطر ہے اسی آگ میں جلنے کے لیے

مشکلیں امتِ مرحوم کی آساں کر دے
جنسِ نایابِ محبت کو پھر ارزاں کر دے

مورِ بے مایہ کو ہمدوشِ سلیماں کر دے
یعنی ہم دیر نشینوں کو مسلماں کر دے

جوئے خوں می چکد از حسرتِ دیرینۂ ما
می تپد نالہ بہ نشتر کدۂ سینۂ ما

بوئے گل لے گئی بیرونِ چمن رازِ چمن
کیا قیامت ہے کہ خود پھول ہیں غمازِ چمن
عہدِ گل ختم ہوا۔ ٹوٹ گیا سازِ چمن
اڑ گئے ڈالیوں سے زمزمہ پردازِ چمن

ایک بلبل ہے کہ ہے محوِ ترنم اب تک
اس کے سینے میں ہے نغموں کا تلاطم اب تک

قمریاں شاخِ صنوبر سے گریزاں بھی ہوئیں
پتیاں پھول کی جھڑ جھڑ کے پریشاں بھی ہوئیں
وہ پرانی روشیں باغ کی ویراں بھی ہوئیں
ڈالیاں پیرہنِ برگ سے عریاں بھی ہوئیں

قید موسم سے طبیعت رہی آزاد اس کی
کاش گلشن میں سمجھتا کوئی فریاد اس کی

لطف مرنے میں ہے باقی نہ مزہ جینے میں
کچھ مزہ ہے تو یہی خونِ جگر پینے میں
کتنے بیتاب ہیں جوہر مرے آئینے میں
کس قدر جلوے تڑپتے ہیں مرے سینے میں

اس گلستاں میں مگر دیکھنے والے ہی نہیں
داغ جو سینے میں رکھتے ہیں وہ لالے ہی نہیں

چاک اس بلبلِ تنہا کی نوا سے دل ہوں
جاگنے والے اسی بانگِ درا سے دل ہوں
یعنی پھر زندہ نئے عہدِ وفا سے دل ہوں
پھر اسی بادۂ دیرینہ کے پیاسے دل ہوں

عجمی خم ہے تو کیا! مے تو حجازی ہے مری
نغمہ ہندی ہے تو کیا! لے تو حجازی ہے مری

(۲۲۷) پرندے کی فریاد

بچوں کے لیے

آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانا
وہ باغ کی بہاریں وہ سب کا چہچہانا

آزادیاں کہاں وہ اب اپنے گھونسلے کی
اپنی خوشی سے آنا اپنی خوشی سے جانا

لگتی ہے چوٹ دل پر آتا ہے یاد جس دم
شبنم کے آنسوؤں پر کلیوں کا مسکرانا

وہ پیاری پیاری صورت وہ کامنی سی مورت
آباد جس کے دم سے تھا میرا آشیانا

آتی نہیں صدائیں اس کی مرے قفس میں
ہوتی مری رہائی اے کاش میرے بس میں

کیا بدنصیب ہوں میں گھر کو ترس رہا ہوں
ساتھی تو ہیں وطن میں میں قید میں پڑا ہوں

آئی بہار کلیاں پھولوں کی ہنس رہی ہیں
میں اس اندھیرے گھر میں قسمت کو رو رہا ہوں

اس قید کا الٰہی دکھڑا کسے سناؤں
ڈر ہے یہیں قفس میں میں غم سے مر نہ جاؤں

جب سے چمن چھٹا ہے یہ حال ہو گیا ہے
دل غم کو کھا رہا ہے غم دل کو کھا رہا ہے

گانا اسے سمجھ کر خوش ہوں نہ سننے والے
دکھے ہوئے دلوں کی فریاد یہ صدا ہے

آزاد مجھ کو کر دے او قید کرنے والے
میں بے زباں ہوں قیدی تو چھوڑ کر دعا لے

(۲۲۸) ایک آرزو

دُنیا کی محفلوں سے اُکتا گیا ہوں یارب — کیا لطف انجمن کا جب دل ہی بجھ گیا ہو

شورش سے بھاگتا ہوں دل ڈھونڈتا ہے میرا — ایسا سکوت جس پر تقریر بھی فدا ہو

مرتا ہوں خامشی پر یہ آرزو ہے میری — دامن میں کوہ کے اک چھوٹا سا جھونپڑا ہو

آزاد فکر سے ہوں عزلت میں دن گزاروں — دُنیا کے غم کا دل سے کانٹا نکل گیا ہو

لذت سرود کی ہو چڑیوں کے چہچہوں میں — چشمے کی شورشوں میں باجا سا بج رہا ہو

گُل کی کلی چٹک کر پیغام دے کسی کا — ساغر ذرا سا گویا مجھ کو جہاں نما ہو

ہو ہاتھ کا سرہانا سبزہ کا ہو بچھونا — شرمائے جس سے جلوت خلوت میں وہ ادا ہو

مانوس اس قدر ہو صورت سے میری بُلبُل — ننھے سے دل میں اس کے کھٹکا نہ کچھ مرا ہو

صف باندھے دونوں جانب بُوٹے ہرے ہرے ہوں — ندی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہو

ہو دلفریب ایسا کہسار کا نظارہ — پانی بھی موج بنکر اُٹھ اُٹھ کے دیکھتا ہو

آغوش میں زمیں کی سویا ہوا ہو سبزہ — پھر پھر کے جھاڑیوں میں پانی چمک رہا ہو

پانی کو چھو رہی ہو جھک جھک کے گُل کی ٹہنی — جیسے حسین کوئی آئینہ دیکھتا ہو

مہندی لگائے سورج جب شام کی دلہن کو — سُرخی لیے سنہری ہر پھول کی قبا ہو

راتوں کو چلنے والے رہ جائیں تھک کے جس دم — اُمید ان کی میرا ٹوٹا ہوا دیا ہو

بجلی چمک کے اُن کو کٹیا مری دکھا دے — جب آسماں پہ ہر سو بادل گھرا ہوا ہو

پچھلے پہر کی کوئل، وہ صبح کی موذن
میں اس کا ہمنوا ہوں، وہ میری ہمنوا ہو

کانوں پہ ہو نہ میرے دیر و حرم کا احساں
روزن ہی جھونپڑی کا مجھ کو سحر نما ہو

پھولوں کو آئے جس دم شبنم وضو کرانے
رونا مرا وضو ہو، نالہ مری دعا ہو

اس خامشی میں جائیں اتنے بلند نالے
تاروں کے قافلے کو میری صدا درا ہو

ہر دردمند دل کو رونا مرا رلا دے
بے ہوش جو پڑے ہیں شاید انھیں جگا دے

(۲۲۹) سیّد کی لوحِ تربت

اے کہ تیرا مرغِ جاں تارِ نفس میں ہے اسیر
اے کہ تیری روح کا طائر قفس میں ہے اسیر

اس چمن کے نغمہ پیراؤں کی آزادی تو دیکھ
شہر جو اجڑا ہوا تھا اس کی آبادی تو دیکھ

فکر رہتی تھی مجھے جس کی وہ محفل ہے یہی
صبر و استقلال کی کھیتی کا حاصل ہے یہی

سنگِ تربت ہے ترا گرویدۂ تقریر دیکھ
چشمِ باطن سے ذرا اس لوح کی تحریر دیکھ

مدعا تیرا اگر دنیا میں ہے تعلیمِ دیں
ترکِ دنیا قوم کو اپنی نہ سکھلانا کہیں

وا نہ کرنا فرقہ بندی کے لئے اپنی زباں
چھپ کے ہے بیٹھا ہوا ہنگامۂ محشر یہاں

وصل کے اسباب پیدا ہوں تری تحریر سے
دیکھ کوئی دل نہ دکھ جائے تری تقریر سے

محفلِ نو میں پرانی داستانوں کو نہ چھیڑ

رنگ پر جو اب آئیں ان فسانوں کو نہ چھیڑ

تو اگر کوئی مدبر ہے تو سن میری صدا
ہے دلیری دست ارباب سیاست کا عصا
عرض مطلب سے جھجک جانا نہیں زیبا تجھے
نیک ہے نیت اگر تیری تو کیا پروا تجھے

بندۂ مومن کا دل بیم و ریا سے پاک ہے
قوت فرماں روا کے سامنے بے باک ہے

ہو اگر ہاتھوں میں تیرے خامۂ معجز رقم
شیشۂ دل ہو اگر تیرا مثال جام جم
پاک رکھ اپنی زباں تلمیذ رحمانی ہے تو
ہو نہ جائے دیکھنا تیری صدا بے آبرو

سونے والوں کو جگا دے شعر کے اعجاز سے
خرمن باطل جلا دے شعلۂ آواز سے

(۱۳۳) چاند

میرے ویرانے سے کوسوں دور ہے تیرا وطن
ہے مگر دریائے دل تیری کشش سے موجزن
قصد کس محفل کا ہے آتا ہے کس محفل سے تو
زرد رو شاید ہوا رنج رہ منزل سے تو
آفرینش میں سراپا نور تو ظلمت ہوں میں
اس سیہ روزی پہ لیکن تیرا ہم قسمت ہوں میں

آہ! میں جلتا ہوں سوزِ اشتیاقِ دید سے
تو سراپا سوز داغِ منّتِ خورشید سے

ایک حلقے پر اگر قایم تری رفتار ہے
میری گردش بھی مثالِ گردشِ پرکار ہے

زندگی کی رہ میں سرگرداں ہے تو، حیراں ہوں میں
تو فروزاں محفلِ ہستی میں ہے، سوزاں ہوں میں

میں رہِ منزل میں ہوں، تو بھی رہِ منزل میں ہے
تیری محفل میں جو خاموشی ہے میرے دل میں ہے

تو طلب خو ہے، تو میرا بھی یہی دستور ہے
چاندنی ہے نور تیرا، عشق میرا نور ہے

انجمن ہے ایک میری بھی جہاں رہتا ہوں میں
بزم میں اپنی اگر یکتا ہے تو تنہا ہوں میں

مہر کا پرتو ترے حق میں ہے پیغامِ اجل
محو کر دیتا ہے مجھ کو جلوۂ حسنِ ازل

پھر بھی اے ماہِ مبیں! میں اور ہوں تو اور ہے
درد جس پہلو میں اٹھتا ہو وہ پہلو اور ہے

گرچہ میں ظلمت سراپا ہوں، سراپا نور تو
سیکڑوں منزل ہے ذوقِ آگہی سے دور تو
جو مری ہستی کا مقصد ہے مجھے معلوم ہے
یہ چمک وہ ہے جبیں جس سے تری محروم ہے

(۲۳۱) پیامِ عشق

سُن اے طلبگارِ دردِ پہلو! میں ناز ہوں تو نیاز ہو جا
میں غزنوی سومناتِ دل کا ہوں تو سراپا ایاز ہو جا
نہیں ہے وابستہ زیر گردوں کمال شانِ سکندری سے
تمام ساماں ہے تیرے سینے میں تو بھی آئینہ ساز ہو جا
غرض ہے پیکارِ زندگی سے کمال پائے ہلال تیرا
جہاں کا فرضِ قدیم ہے تو، ادا مثالِ نماز ہو جا
نہ ہو قناعت شعار گلچیں، اسی سے قایم ہے شان تیری
وفورِ گل ہے اگر چمن میں تو اور دامن دراز ہو جا
گئے وہ ایام، اب زمانہ نہیں ہے صحرانوردیوں کا
جہاں میں مانندِ شمعِ سوزاں میانِ محفل گداز ہو جا

وجود افراد کا مجازی ہے ہستیِ قوم ہے حقیقی
فدا ہو ملت پہ یعنی، آتش زن طلسمِ مجاز ہو جا
یہ ہند کے فرقہ ساز اقبال آزری کر رہے ہیں گویا
بچا کے دامن بتوں سے اپنا غبارِ راہِ حجاز ہو جا

(۲۳۲) غزل

زمانہ دیکھے گا جب مرے دل سے محشر اٹھے گا گفتگو کا
مری خموشی نہیں ہے گویا مزار ہے حرفِ آرزو کا
جو موجِ دریا لگی یہ کہنے سفر سے قایم ہے شان میری
گہر یہ بولا صدف نشینی ہے مجھ کو سامان آبرو کا
نہ ہو طبیعت ہی جن کی قابل وہ تربیت سے نہیں سنورتے
ہوا نہ سرسبز رہ کے پانی میں عکس سروِ کنارِ جو کا
کوئی دل ایسا نظر نہ آیا نہ جس میں خوابیدہ ہو تمنا
الٰہی تیرا جہان کیا ہے! نگار خانہ ہے آرزو کا
کھلا یہ مر کر کہ زندگی اپنی تھی طلسمِ ہوس سراپا
جسے سمجھتے تھے جسمِ خاکی، غبار تھا کوئے آرزو کا
اگر کوئی شئے نہیں ہے پنہاں، تو کیوں سراپا تلاش ہوں میں
نگہ کو نظارے کی تمنا ہے، دل کو سودا ہے جستجو کا

چمن میں گلچیں سے غنچہ کہتا تھا، اتنا بیدرد کیوں ہے انساں
تری نگاہوں میں ہے تبسم شکستہ ہونا مرے سبو کا

ریاضِ ہستی کے ذرّے ذرّے سے ہے محبت کا جلوہ پیدا
حقیقتِ گل کو تو سمجھے تو یہ بھی پیماں ہے رنگ و بو کا

تمام مضموں مرے پرانے، کلام میرا خطا سراپا
ہنر کوئی دیکھتا ہے مجھ میں تو عیب ہے میرے عیب جو کا

سپاس شرطِ ادب ہے ورنہ کرم ترا ہے ستم سے بڑھ کر
ذرا سا اک دل دیا ہے وہ بھی فریب خوردہ ہے آرزو کا

کمالِ وحدت عیاں ہے ایسا کہ نوکِ نشتر سے تو جو چھیڑے
یقیں ہے مجھ کو گرے رگِ گل سے قطرہ انسان کے لہو کا

گیا ہے تقلید کا زمانہ، مجاز رختِ سفر اٹھائے
ہوئی حقیقت ہی جب نمایاں تو کس کو یارا ہے گفتگو کا

جو گھر سے اقبال دور ہوں میں تو ہوں نہ محزوں عزیز میرے
مثالِ گوہر وطن کی فرقت کمال ہے میری آبرو کا

(۲۳۳) غزل

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا، عام دیدارِ یار ہوگا
سکوت تھا پردہ دار جس کا وہ راز اب آشکار ہوگا

گزر گیا اب وہ دور ساقی کہ چھپ کے پیتے تھے پینے والے
بنے گا سارا جہان میخانہ، ہر کوئی بادہ خوار ہوگا

کبھی جو آوارۂ جنوں تھے، وہ بستیوں میں پھر آبسیں گے
برہنہ پائی وہی رہے گی مگر نیا خارزار ہوگا

سُنا دیا گوشِ منتظر کو حجاز کی خامشی نے آخر
جو عہد صحرائیوں سے باندھا گیا تھا پھر استوار ہوگا

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو اُلٹ دیا تھا
سُنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا

کیا مرا تذکرہ جو ساقی نے بادہ خواروں کی انجمن میں
تو پیر میخانہ سُن کے کہنے لگا کہ منہ پھٹ ہے خوار ہوگا

دیارِ مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا

سفینۂ برگِ گل بنائے گا قافلہ مورِ ناتواں کا
ہزار موجوں کی ہو کشاکش، مگر یہ دریا کے پار ہوگا

چمن میں لالہ دکھاتا پھرتا ہے داغ اپنا کلی کلی کو
یہ جانتا ہی کہ اس دکھاوے سے دل جلوں میں شمار ہوگا
جو ایک تھا ای نگاہ! تو نے ہزار کر کے ہمیں دکھایا
یہی اگر کیفیت ہے تیری تو پھر کسے اعتبار ہوگا
کہا جو قمری سے میں نے اک دن یہاں کے آزاد پا بگل ہیں
تو غنچے کہنے لگے، ہمارے چمن کا یہ رازدار ہوگا
خدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں، بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اس کا بندہ بنوں گا جس کا خدا کے بندوں سے پیار ہوگا
یہ رسمِ بزمِ فنا ہی ای دل! گناہ ہے جنبشِ نظر بھی
رہے گی کیا آبرو ہماری جو تو یہاں بے قرار ہوگا
میں ظلمتِ شب میں لیکے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو
شرر فشاں ہوگی آہ میری، نفس مرا شعلہ بار ہوگا
نہیں ہی غیر از نمود کچھ بھی جو مدعا تیری زندگی کا
تو اک نفس میں جہاں سے مٹنا تجھے مثالِ شرار ہوگا

نہ پوچھو اقبال کا ٹھکانا، ابھی وہی کیفیت ہی اس کی
کہیں سرِ رہ گزار بیٹھا ستم کشِ انتظار ہوگا

(۲۳۴) فلسفۂ غم

(میاں فضل حسین صاحب بیرسٹر ایٹ لا لاہور کے نام)

گو سراپا کیفِ عشرت ہے شرابِ زندگی
اشک بھی رکھتا ہے دامن میں سحابِ زندگی

موجِ غم پر رقص کرتا ہے حبابِ زندگی
ہے الم کا سورہ بھی جزوِ کتابِ زندگی

ایک بھی پتی اگر کم ہو تو وہ گل ہی نہیں
جو خزاں نادیدہ ہو بلبل، وہ بلبل ہی نہیں

آرزو کے خون سے رنگیں ہے دل کی داستاں
نغمۂ انسانیت کامل نہیں غیر از فغاں

دیدۂ بینا میں داغِ غم چراغِ سینہ ہے
روح کو سامانِ زینت آہ کا آئینہ ہے

حادثاتِ غم سے ہے انساں کی فطرت کو کمال
غازہ ہے آئینۂ دل کے لیے گردِ ملال

غم جوانی کو جگا دیتا ہے لطفِ خواب سے
ساز یہ بیدار ہوتا ہے اسی مضراب سے

طائرِ دل کے لیے غم شہپرِ پرواز ہے
راز ہے انساں کا دل، غم انکشافِ راز ہے

غم نہیں غم، روح کا اک نغمۂ خاموش ہے
جو سرودِ بربطِ ہستی سے ہم آغوش ہے

شام جس کی آشنائے نالۂ "یا رب" نہیں
جلوہ پیرا جس کی شب میں اشک کے کوکب نہیں

جس کا جامِ دل شکستِ غم سے ہے ناآشنا
جو سدا مستِ شرابِ عیش و عشرت ہی رہا

ہاتھ جس گلچیں کا ہے محفوظ نوکِ خار سے
عشق جس کا بے خبر ہے ہجر کے آزار سے

کلفتِ غم گرچہ اسکے روز و شب سے دور ہے
زندگی کا راز اس کی آنکھ سے مستور ہے

ہے کہ تنظیمِ دہر کا اور اک جوہر حاصل تجھے
کیوں نہ آساں ہو غم و اندوہ کی منزل تجھے

ہے ابد کے نسخۂ دیرینہ کی تمہید عشق
عقلِ انسانی ہے فانی، زندۂ جاوید عشق

عشق کے خورشید سے شامِ اجل شرمندہ ہے
عشق سوزِ زندگی ہے تا ابد پائندہ ہے

رخصتِ محبوب کا مقصد فنا ہوتا اگر
جوشِ الفت بھی دلِ عاشق سے کر جاتا سفر

عشق کچھ محبوب کے مرنے سے مر جاتا نہیں
روح میں غم بن کے رہتا ہے مگر جاتا نہیں

ہے بقائے عشق سے پیدا بقا محبوب کی
زندگانی ہے عدم ناآشنا محبوب کی

آتی ہے ندی جبینِ کوہ سے گاتی ہوئی
آسماں کے طائروں کو نغمہ سکھلاتی ہوئی

آئنہ روشن ہے اس کا صورتِ رخسارِ حور
گر کے وادی کی چٹانوں پر یہ ہو جاتا ہے چور

نہر جو تھی اسکے گوہر پیارے پیارے بن گئے
یعنی اس افتاد سے پانی کے تارے بن گئے

جوئے سیمابِ رواں پھٹ کر پریشاں ہو گئی
مضطرب بوندوں کی اک دنیا نمایاں ہو گئی

ہجر ان قطروں کو لیکن وصل کی تعلیم ہے
دو قدم پر پھر وہی جو مثلِ تارِ سیم ہے

ایک اصلیت میں ہے نہرِ روانِ زندگی
گر کے رفعت سے ہجومِ نوعِ انساں بن گئی

پستیٔ عالم میں ملنے کو جدا ہوتے ہیں ہم
عارضی فرقت کو دائم جان کر روتے ہیں ہم

مرنے والے مرتے ہیں لیکن فنا ہوتے نہیں	یہ حقیقت میں کبھی ہم سے جدا ہوتے نہیں
عقل جس دم دہر کی آفات میں محصور ہو	یا جوانی کی اندھیری رات میں مستور ہو
دامنِ دل بن گیا ہو رزمگاہِ خیر و شر	راہ کی ظلمت سے ہو مشکل سوئے منزل سفر
خضرِ ہمت ہو گیا ہو آرزو سے گوشہ گیر	فکر جب عاجز ہو اور خاموش آوازِ ضمیر
وادیٔ ہستی میں کوئی ہمسفر تک بھی نہ ہو	جادہ دکھلانے کو جگنو کا شرر تک بھی نہ ہو

مرنے والوں کی جبیں روشن ہے اس ظلمات میں
جس طرح تارے چمکتے ہیں اندھیری رات میں

(۲۳۵) خطاب بہ جوانانِ اسلام

کبھی اے نوجواں مسلم! تدبر بھی کیا تو نے	وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا
تجھے اس قوم نے پالا ہے آغوشِ محبت میں	کچل ڈالا تھا جس نے پاؤں سے تاجِ سرِ دارا
تمدن آفریں خلاقِ آئینِ جہانداری	وہ صحرائے عرب یعنی شتربانوں کا گہوارا
سماں الفقر فخری کا رہا شانِ امارت میں	بآب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبا را
گدائی میں بھی وہ اللہ والے تھے غیور اتنے	کہ منعم کو گدا کے ڈر سے بخشش کا نہ تھا یارا
غرض میں کیا کہوں تجھ سے کہ وہ صحرا نشیں کیا تھے	جہانگیر و جہاندار و جہانبان و جہاں آرا
اگر چاہوں تو نقشہ کھینچ کر الفاظ میں رکھ دوں	مگر تیرے تخیل سے فزوں تر ہے وہ نظارہ
تجھے آبا سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی	کہ تو گفتار، وہ کردار، تو ثابت وہ سیارا

گنوا دی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی
ثریا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا

حکومت کا تو کیا رونا کہ وہ اک عارضی شے تھی
نہیں دنیا کے آئینِ مسلَّم سے کوئی چارا

مگر وہ علم کے موتی، کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارا

"غنی روزِ سیاہ پیرِ کنعاں را تماشا کن
کہ نورِ دیدہ اش روشن کند چشمِ زلیخا را"

(۲۳۶) فاطمہ بنت عبد اللہ

عرب لڑکی جو طرابلس کی جنگ میں غازیوں کو پانی پلاتی ہوئی شہید ہوئی

فاطمہ! تو آبروئے امتِ مرحوم ہے
ذرہ ذرہ تیری مشتِ خاک کا معصوم ہے

یہ سعادت حورِ صحرائی! تری قسمت میں تھی
غازیانِ دیں کی سقائی تری قسمت میں تھی

یہ جہاد اللہ کے رستے میں بے تیغ و سپر!
ہے جسارت آفریں شوقِ شہادت کس قدر!

یہ کلی بھی اس گلستانِ خزاں منظر میں تھی!
ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی

اپنے صحرا میں بہت آہو ابھی پوشیدہ ہیں
بجلیاں برسے ہوئے بادل میں بھی خوابیدہ ہیں

فاطمہ! گو شبنم افشاں آنکھ تیرے غم میں ہے
نغمۂ عشرت بھی اپنے نالۂ ماتم میں ہے

رقص تیری خاک کا کتنا نشاط انگیز ہے
ذرہ ذرہ زندگی کے سوز سے لبریز ہے

ہے کوئی ہنگامہ تیری تربتِ خاموش میں
پل رہی ہے ایک قومِ تازہ اس آغوش میں

بے خبر ہوں گرچہ انکی وسعتِ مقصد سے میں
آفرینش دیکھتا ہوں انکی اس مرقد سے میں

تازہ انجم کا فضائے آسماں میں ہے ظہور
دیدۂ انساں سے نامحرم ہے جنکی موجِ نور

جو ابھی ابھرے ہیں ظلمت خانۂ ایام سے
جنکی ضو نا آشنا ہے قیدِ صبح و شام سے

جنکی تابانی میں اندازِ کہن بھی نو بھی ہے
اور تیرے کوکبِ تقدیر کا پرتو بھی ہے

(۲۳۷) والدہ مرحومہ کی یاد میں

ذرہ ذرہ دہر کا زندانیِ تقدیر ہے
پردۂ مجبوری و بیچارگی تدبیر ہے

آسماں مجبور ہے شمس و قمر مجبور ہیں
انجمِ سیماب پا رفتار پر مجبور ہیں

ہے شکستِ انجام غنچے کا سبو گلزار میں
سبزہ و گل بھی ہیں مجبورِ نمو گلزار میں

نغمۂ بلبل ہو یا آوازِ خاموشِ ضمیر
ہے اسی زنجیرِ عالم گیر میں ہر شے اسیر

آنکھ پر ہوتا ہے جب یہ سرِ مجبوری عیاں
خشک ہو جاتا ہے دل میں اشک کا سیلِ رواں

قلبِ انسانی میں رقصِ عیش و غم رہتا نہیں
نغمہ رہ جاتا ہے، لطفِ زیر و بم رہتا نہیں

علم و حکمت رہزنِ سامانِ اشک و آہ ہے
یعنی اک الماس کا ٹکڑا دلِ آگاہ ہے!

گرچہ میرے باغ میں شبنم کی شادابی نہیں
آنکھ میری مایہ دارِ اشکِ عنابی نہیں

جانتا ہوں آہ، میں آلامِ انسانی کا راز ہے نوائے شکوہ سے خالی مری فطرت کا ساز

میرے لب پر قصۂ نیرنگیِ دوراں نہیں دل مرا حیراں نہیں، خنداں نہیں، گریاں نہیں

پر تری تصویر قاصد گریۂ پیہم کی ہے
آہ! یہ تردید میری حکمتِ محکم کی ہے

گریۂ سرشار سے بنیادِ جاں پائندہ ہے درد کے عرفاں سے عقلِ سنگدل شرمندہ ہے

موجِ دودِ آہ سے آئینہ ہے روشن مرا گنجِ آبِ آورد سے معمور ہے دامن مرا

حیرتی ہوں میں تری تصویر کے اعجاز کا رخ بدل ڈالا ہے جس نے وقت کی پرواز کا

رفتہ و حاضر کو گویا پا بپا اس نے کیا عہدِ طفلی سے مجھے پھر آشنا اس نے کیا

جب ترے دامن میں پلتی تھی وہ جانِ ناتواں بات سے اچھی طرح محرم نہ تھی جس کی زباں

اور اب چرچے ہیں جس کی شوخیِ گفتار کے
بے بہا موتی ہیں جس کی چشمِ گوہر بار کے

علم کی سنجیدہ گفتاری، بڑھاپے کا شعور دنیوی اعزاز کی شوکت، جوانی کا غرور

زندگی کی اوج گاہوں سے اتر آتے ہیں ہم سایۂ مادر میں طفلِ سادہ رہ جاتے ہیں ہم

بے تکلف خندہ زن ہیں، فکر سے آزاد ہیں
پھر اسی کھوئے ہوئے فردوس میں آباد ہیں

کس کو اب ہوگا وطن میں آہ! میرا انتظار کون میرا خط نہ آنے سے رہے گا بے قرار

خاکِ مرقد پر تری لے کر یہ فریاد آؤں گا اب دعائے نیم شب میں کس کو میں یاد آؤں گا

تربیت سے تیری میں انجم کا ہم قسمت ہوا
گھر مرے اجداد کا سرمایۂ عزت ہوا

دفترِ ہستی میں تھی زریں ورق تیری حیات
تھی سراپا دین و دنیا کا سبق تیری حیات

عمر بھر تیری محبت میری خدمت گر رہی
میں تری خدمت کے قابل جب ہوا تو چل بسی

وہ جواں قامت میں ہے جو صورتِ سروِ بلند
تیری خدمت سے ہوا جو مجھ سے بڑھ کر بہرہ مند

کاروبارِ زندگانی میں وہ ہم پہلو مرا
وہ محبت میں تری تصویر وہ بازو مرا

تجھ کو مثلِ طفلکِ بے دست و پا روتا ہے وہ
صبر سے ناآشنا صبح و مسا روتا ہے وہ

تخم جس کا تو ہماری کشتِ جاں میں بو گئی
شرکتِ غم سے وہ الفت اور محکم ہو گئی

آہ! یہ دنیا، یہ ماتم خانۂ برنا و پیر!
آدمی ہے کس طلسمِ دوش و فردا میں اسیر

کتنی مشکل زندگی ہے! کس قدر آساں ہے موت!
گلشنِ ہستی میں مانندِ نسیم ارزاں ہے موت

زلزلے ہیں بجلیاں ہیں قحط ہیں آلام ہیں
کیسی کیسی دخترانِ مادرِ ایام ہیں

کلبۂ افلاس میں دولت کے کاشانے میں موت
دشت و در میں شہر میں گلشن میں ویرانے میں موت

موت ہے ہنگامہ آرا قلزمِ خاموش میں
ڈوب جاتے ہیں سفینے موج کی آغوش میں

نَے مجالِ شکوہ ہے نَے طاقتِ گفتار ہے
زندگانی کیا ہے، اک طوقِ گلو افشار ہے

قافلے میں غیرِ فریادِ درا کچھ بھی نہیں
اک متاعِ دیدۂ تر کے سوا کچھ بھی نہیں

ختم ہو جائے گا لیکن امتحاں کا دور بھی
ہیں پسِ نہ پردۂ گردوں ابھی دور اور بھی

سینہ چاک اس گلستاں میں لالہ و گل ہیں تو کیا
نالہ و فریاد پر مجبور بلبل ہیں تو کیا

جھاڑیاں جن کے قفس میں قید ہے آہِ خزاں
سبز کر دے گی انھیں بادِ بہار جاوداں

خفتہ خاکِ پے سپر میں ہے شرار اپنا تو کیا
عارضی محمل ہے یہ مشتِ غبار اپنا تو کیا

زندگی کی آگ کا انجام خاکستر نہیں
ٹوٹنا جس کا مقدر ہو یہ وہ گوہر نہیں

زندگی محبوب ایسی دیدۂ قدرت میں ہے
ذوقِ حفظِ زندگی ہر چیز کی فطرت میں ہے

موت کے ہاتھوں سے مٹ سکتا اگر نقشِ حیات
عام یوں اس کو نہ کر دیتا نظامِ کائنات

ہے اگر ارزاں تو یہ سمجھو اجل کچھ بھی نہیں
جس طرح سونے سے جینے میں خلل کچھ بھی نہیں

آہ! غافل موت کا رازِ نہاں کچھ اور ہے
نقش کی ناپائداری سے عیاں کچھ اور ہے

جنتِ نظارہ ہے نقشِ ہوا بالائے آب
موجِ مضطر توڑ کر تعمیر کرتی ہے حباب

موج کے دامن میں پھر اس کو چھپا دیتی ہے یہ
کتنی بیدردی سے نقش اپنا مٹا دیتی ہے یہ

پھر نہ کر سکتی حباب اپنا اگر پیدا ہوا
توڑنے میں اس کے یوں ہوتی نہ بے پروا ہوا

اس روش کا کیا اثر ہے ہیئتِ تعمیر پر
یہ تو حجت ہے ہوا کی قوتِ تعمیر پر

فطرتِ ہستی شہیدِ آرزو رہتی نہ ہو
خوب تر پیکر کی اس کو جستجو رہتی نہ ہو

آہ! سیماب پریشاں، انجمِ گردوں فروز
شوخ یہ چنگاریاں، ممنونِ شب ہے جن کا سوز

عقل جس سے سر بہ زانو ہے وہ مدت ان کی ہے
سرگزشتِ نوعِ انساں ایک ساعت ان کی ہے

پھر یہ انساں آں سوئے افلاک ہے جس کی نظر
قدسیوں سے بھی مقاصد میں ہے جو پاکیزہ تر

جو مثالِ شمع روشن محفلِ قدرت میں ہے
آسماں اک نقطہ جسکی وسعتِ فطرت میں ہے

جسکی نادانی صداقت کے لئے بیتاب ہے
جسکا ناخن سازِ ہستی کے لئے مضراب ہے

شعلہ یہ کمتر ہے گردوں کے شراروں سے بھی کیا؟
کم بہا ہے آفتاب اپنا ستاروں سے بھی کیا

تخمِ گل کی آنکھ زیرِ خاک بھی بے خواب ہے
کس قدر نشو و نما کے واسطے بیتاب ہے

زندگی کا شعلہ اس دانے میں جو مستور ہے
خود نمائی، خود فزائی کے لئے مجبور ہے

سردیِ مرقد سے بھی افسردہ ہو سکتا نہیں
خاک میں دب کر بھی اپنا سوز کھو سکتا نہیں

پھول بن کر اپنی تربت سے نکل آتا ہے یہ
موت سے گویا قبائے زندگی پاتا ہے یہ!

ہے لحد اس قوتِ آشفتہ کی شیرازہ بند
ڈالتی ہے گردنِ گردوں میں جو اپنی کمند

موت تجدیدِ مذاقِ زندگی کا نام ہے
خواب کے پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے

خوگرِ پرواز کو پرواز میں ڈر کچھ نہیں
موت اس گلشن میں جز سنجیدنِ پر کچھ نہیں

کہتے ہیں اہلِ جہاں دردِ اجل ہے لادوا
زخمِ فرقت وقت کے مرہم سے پاتا ہے شفا

دل مگر غم مرنے والوں کا جہاں آباد ہے
حلقۂ زنجیرِ صبح و شام سے آزاد ہے

وقت کے افسوں سے تھمتا نالۂ ماتم نہیں
وقت زخمِ تیغِ فرقت کا کوئی مرہم نہیں

سر پہ آجاتی ہے جب کوئی مصیبت ناگہاں
اشک پیہم دیدۂ انساں سے ہوتے ہیں رواں

رابطہ ہو جاتا ہے دل کو نالہ و فریاد سے
خون دل بہتا ہے آنکھوں کی سرشک آباد سے

آدمی تاب شکیبائی سے گو محروم ہے
اس کی فطرت میں یہ اک احساس نا معلوم ہے

ق

جوہر انساں عدم سے آشنا ہوتا نہیں
آنکھ سے غائب تو ہوتا ہے، فنا ہوتا نہیں

رخت ہستی خاک غم کی شعلہ افشانی سے ہے
سرد یہ آگ اس لطیف احساس کے پانی سے ہے

آہ یہ ضبط فغاں غفلت کی خاموشی نہیں
آگہی ہے یہ دلآسائی، فراموشی نہیں

پردہ مشرق سے جس دم جلوہ گر ہوتی ہے صبح
داغ شب کا دامن آفاق سے دھوتی ہے صبح

لالہ افسردہ کو آتش قبا کرتی ہے یہ
بے زباں طائر کو مست نوا کرتی ہے صبح

سینۂ بلبل کے زنداں سے سرود آزاد ہے
سیکڑوں نغموں سے باد صبح دم آباد ہے

خفتگان لالہ زار و کوہسار و رود بار
ہوتے ہیں آخر عروس زندگی سے ہمکنار

یہ اگر آئین ہستی ہے کہ ہو ہر شام صبح
مرقد انساں کی شب کا کیوں نہ ہو انجام صبح

دام سیمین تخیل ہے مرا آفاق گیر
کر لیا ہے جس سے تیری یاد کو میں نے اسیر

یاد سے تیری دل درد آشنا معمور ہے
جیسے کعبے میں دعاؤں سے فضا معمور ہے

وہ فرائض کا تسلسل نام ہے جس کا حیات
جلوہ گاہیں اس کی ہیں لاکھوں جہان بے ثبات

مختلف ہر منزل ہستی کی رسم و راہ ہے
آخرت بھی زندگی کی ایک جولاں گاہ ہے

ہے وہاں بے حاصلی کشت اجل کے واسطے
سازگار آب و ہوا تخم عمل کے واسطے

نورِ فطرت ظلمتِ پیکر کا زندانی نہیں
زندگانی تھی تری مہتاب سے تابندہ تر
مثلِ ایوانِ سحر مرقد فروزاں ہو ترا

تنگ ایسا حلقۂ افکارِ انسانی نہیں
خوب تر تھا صبح کے تارے سے بھی تیرا سفر
نور سے معمور یہ خاکی شبستاں ہو ترا

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

(۹۰) ناظرؔ ۱۸۷۲ء

چودھری خوشی محمد خاں بہادر خلف چودھری مولی داد خاں - ہریا دالا ضلع گجرانوالہ کے باشندے ہیں سال پیدایش تقریباً ۱۸۷۲ء مطابق ۱۲۸۹ھ ہے ۱۸۹۳ء میں علی گڑھ کالج سے بی - اے پاس کیا - زمانہ طالب علمی سے شعر گوئی کا شوق تھا فن سخن میں خواجہ حالی مرحوم کے شاگرد ہیں - ریاست کشمیر میں عہدۂ گورنری پر مامور ہیں - غزل گو نہیں ہیں صرف حالیہ نظمیں لکھتے ہیں جو علوِ خیال کے لحاظ سے پسند کی جاتی ہیں -

نمونہ کلام یہ ہے :-

(۲۳۸) جوگی

کل صبح کے مطلعِ تاباں سے جب عالم بقعۂ نور ہوا
سب چاند ستارے ماند ہوئے خورشید کا نور ظہور ہوا

مستانہ ہوائے گلشن تھی - جانانہ ادائے گلبن تھی
ہر وادی وادیِ ایمن تھی - ہر کوہ پہ جلوۂ طور رہوا

جب بادِ صبا مضراب بنی - ہر شاخِ نہال رباب بنی
شمشاد و چنار ستار بنے - ہر سروِ چمن طنبور بنا

سب طائر مل کر گانے لگے - عرفاں کی تانیں اُڑانے لگے
اشجار بھی وجد میں آنے لگے - عرفاں کی تانیں اُڑانے لگے

سبزے پہ بساط بچھائی تھی - اور بزمِ سرود سجائی تھی
بن میں گلشن میں، آنگن میں، فرشِ سنجاب و سمور ہوا

	تھا دلکش منظرِ دشت و جبل - اور چال صبا کی مستانہ	
	اس حال میں ایک پہاڑی پر جا نکلا نانک سا دیوانہ	
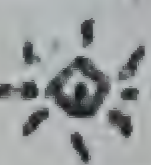
چیلوں نے جھنڈے گاڑے تھے - پربت پر چھاؤنی چھائی تھی
تھے خیمے ڈیرے بادل کے کہرے نے قنات لگائی تھی

یاں برف کے تودے گلتے تھے - چاندی کے فوارے چلتے تھے
چشمے سیماب اُگلتے تھے - نالوں نے دھوم مچائی تھی

یاں تلّہ کوہ پہ رہتا تھا - اک مست قلندر بیراگی
تھی راکھ جٹاؤں میں جوگی کی اور انگ بھبوت رمائی تھی

تھا راکھ کا جوگی کا بستر - اور راکھ کا پیراہن تن پر
تھی ایک لنگوٹی زیب کمر - جو گھٹنوں تک لٹکائی تھی
سب خلقِ خدا سے بیگانہ - وہ مستِ قلندر دیوانہ
بیٹھا تھا جوگی مستانہ - آنکھوں میں مستی چھائی تھی
جوگی سے آنکھیں چار ہوئیں - اور جھک کر میں نے سلام کیا
تب آنکھ اُٹھا کر ناظرؔ سے - یوں بن باسی نے کلام کیا

کیوں بابا ناحق جوگی کو تم کس لئے آ کر ستاتے ہو
ہیں پنکھ پکھیرو بن باسی - تم جال میں آ کے پھنساتے ہو
کوئی جھگڑا دال چپاتی کا - کوئی دعویٰ گھوڑے ہاتھی کا
کوئی شکوہ سنگی ساتھی کا - تم ہم کو سنانے آتے ہو
ہم حرص و ہوا کو چھوڑ چکے - اس نگری سے منہ موڑ چکے
ہم جو زنجیریں توڑ چکے - تم لا کے وہی پہناتے ہو
تم پوجا کرتے ہو دھن کی - ہم سیوا کرتے ہیں ساجن کی
ہم جوت جگاتے ہیں من کی - تم اُس کو آ کے بجھاتے ہو
سنسار سے یاں مکھ پھیرا ہے - من میں ساجن کا ڈیرا ہے
یاں آنکھ لڑائی پیتم سے - تم کس سے آنکھ ملاتے ہو

اُس مست قلندر جوگی نے جب ناظر پر یہ عتاب کیا
کچھ دیر تو ہم خاموش رہے پھر جوگی سے یہ خطاب کیا

ہیں ہم پردیسی سیلانی ۔ مت ناحق طیش میں آ جوگی
ہم آئے تھے تیرے درشن کو ۔ جیون پر میل نہ لا جوگی
آبادی سے منہ پھیرا کیوں ۔ پربت میں کیا ہی ڈیرا کیوں
ہر محفل میں ہر منزل میں ہر دل میں ہی نورِ خدا جوگی
کیا مسجد میں، کیا مندر میں، سب جلوہ ہی وجہ اللہ کا
پربت میں، نگر میں، ساگر میں، ہر اُترا ہی ہر جا جوگی
جی شہر میں خوب بہلتا ہے، واں حسن پہ عشق مچلتا ہی
واں پریم کا ساغر چلتا ہے، چل کے دل بہلا جوگی
واں دل کا غنچہ کھِلتا ہے ۔ ہر رنگ میں موہن ملتا ہے
چل شہر میں سنکھ بجا جوگی ۔ بازار میں دھونی رما جوگی

ان چکنی چپڑی باتوں سے مست جوگی کو پھسلایا
جو آگ بجھائی جتنوں سے ۔ پھر اس پہ نہ تیل گرایا
ہی شہروں میں غل شور بہت ۔ اور حرص و ہوا کا زور بہت
بستے ہیں نگر میں چور بہت ۔ سادھو کی ہے بن میں جا بابا

ہے شہروں میں شورشِ نفسانی۔ جنگل میں ہے جلوۂ نورانی
ہے نگری ڈگری کثرت کی۔ بن وحدت کا دریا بابا
ہم جنگل کے پھل کھاتے ہیں۔ چشموں سے پیاس بجھاتے ہیں
راجہ کے نہ دوارے جاتے ہیں۔ پرجا کی نہیں پروا بابا
سر پر آکاس کا منڈل ہے۔ دھرتی پہ سہانی مخمل ہے
دن کو سورج کی محفل ہے۔ شب کو تاروں کی سبھا بابا
جب جھوم کے یاں گھن آتے ہیں۔ مستی کا رنگ جماتے ہیں
چشمے طنبور بجاتے ہیں۔ گاتی ہے ملار ہوا بابا
یاں پنچھی مِل کر گاتے ہیں۔ پیتم کے سندیش سُناتے ہیں
یاں روپ انوپ دکھاتے ہیں۔ پھل پھول اور گیا بابا
ہے پیٹ کا ہر دم دھیان تمھیں۔ اور یاد نہیں بھگوان تمھیں
سِل پتھر۔ اینٹ۔ مکان تمھیں۔ دیتے ہیں سکھ سے چھڑا بابا
تن من دھن میں لگاتے ہو۔ پیتم کو دل سے بھلاتے ہو
ماٹی میں لال گنواتے ہو۔ تم بندۂ حرص و ہوا بابا

دھن دولت آنی جانی ہے یہ دنیا رام کہانی ہے
یہ عالم۔ عالمِ فانی ہے۔ باقی ہے ذاتِ خدا بابا

(۹۱) نظامی بدایونی سنہ ۱۸۷۲ء

نظامی۔ نظام الدین حسین ولد منشی فخر الدین ساکن بدایوں ۱۲۸۹ھ مطابق ۱۸۷۲ء
میں پیدا ہوئے۔ آپ کا سلسلۂ نسب حضرت عبد الرحمٰن بن ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ
سے ملتا ہے۔ ابتدائے شعور سے شعر و سخن سے ذوق ہے۔ شاعری میں سب سے پہلے حضرت بیخود بدایونی
مرحوم سے استفادہ حاصل کیا۔ اسکے بعد حضرت حالی سے اصلاح لی۔ زمانہ طالبعلمی سے مضمون نگاری
کا شوق تھا۔ بعض اخبارات کو قلمی امداد دیتے رہے۔ ہمیشہ علی گڑھ کالج اور قومی تعلیم کے مسئلہ پر خامہ فرسائی
کی۔ سنہ ۱۹۰۳ء میں بدایوں سے اخبار ذوالقرنین نکالا جو اس وقت تک جاری ہے۔ سنہ ۱۹۱۶ء میں
کلیات شیفتہ یعنی نواب مصطفیٰ خاں مرحوم کے فارسی و اردو کلام کو ترتیب دیا اور اس پر ایک
بسیط مقدمہ لکھا جو حضرت شیفتہ کے صاحبزادہ نواب محمد اسحاق خاں صاحب کے ایما سے
نظامی پریس بدایوں سے شائع ہوا۔ سنہ ۱۹۱۸ء میں اردو دیوان غالب کی شرح لکھی اور اس کا
خوبصورت مجلد نسخہ شائع کیا جو بہت مقبول ہوا۔ ایک کتاب "قاموس المشاہیر" جس میں مشرقی
مشاہیر کے مختصر حالات بہ ترتیب حروف تہجی دیئے گئے ہیں مرتب کی ہے اس کا پہلا حصہ
شائع ہو چکا ہے دوسرا زیر طبع ہے۔ انتخاب زریں کے دوسرے ایڈیشن کے بعد دوسرا حصہ بھی
شائع ہو گیا۔ حسرت قومی نظمیں جو واقعات اور جذبات کا مرقع ہوتی ہیں لکھتے ہیں آپکی مختلف
نظموں کا ایک مجموعہ تجلیات سخن کے نام سے شائع ہو گیا۔ جون سنہ ۱۹۴۴ء میں بدایوں ہی میں انتقال ہوا۔

نمونۂ کلام حسب ذیل ہے:۔

عرضداشت منظوم بہ پیشگاہِ خسرو دکن خلد اللہ ملکہ بہ اُمید قبولیت

قاموس المشاہیر

(۲۳۹)

منبع فیض و کرم ہی بارگاہِ خسروی
جسطرف دیکھو دکن کی روشنی ہی جلوہ گر
صاحبِ اقبال آصفجاہ سلطانِ دکن
ناخنِ تدبیر سے ہی عقدۂ دشوار وا
وجد ہی نوشیرواں کو دنگ ہی کسریٰ کی عقل
تشنۂ علم وادب سے چور ہیں سب اہلِ بزم
فکر ہی ہر دم کہ اُردو کا رہے ساغر رواں
ہو قبولِ شاہ یہ قاموسِ اُردو کیا عجب

مطلعِ مہرِ سعادت نا ردنق کاشانہ ہی
شمع ہی حُسنِ ریاست اک جہاں پروانہ ہی
طالعِ روشن پہ صدقے حشمتِ شاہانہ ہی
ناز ہی اس پر فراست کو کہ وہ فرزانہ ہی
بارگاہِ عدل ہے یا اک تجلّی خانہ ہی
ساقیِ عالی ہمم کے ہاتھ میں پیمانہ ہی
علم و فن میں ہو ترقی فکر یہ روزانہ ہی
دفترِ تاریخ ہی، اسلاف کا افسانہ ہی

اے نظامی کیوں نہ ہو تو موردِ لطفِ نظام
پائے نسبت تیرے حق میں جود کا پروانہ ہی

(۲۴۰) اسلام اور حکومتِ الٰہی کی بنیاد

یہ دہر میں ہی تقاضائے گردشِ ایام
شعاعِ حُسن سے خلوت نشیں ہو لیلیِ شب

نمودِ صبح سے ہو جلوہ ریز رحمتِ عام
طلوعِ مہر سے ہو پردہ پوشِ ماہِ تمام

ضیائے نور سے ہو محوِ تابشِ انجم
نسیم صبح بچھائے سرور و کیف کا دام

نہ ہوں گناہ کے بادل نہ قہر کی ہو گرج
عمل کسی کے نہ ہوں شکل گیسوئے شب فام

وہ روشنی ہو نہ تاریکیاں رہیں باقی
فروغِ جلوۂ تاباں ہو لمعۂ الہام

چمن چمن کی فضا پہ ہو اک نیا عالم
عرب بہار سے معمور ہو منوّر شام

خدا کے حکم سے پوری ہوئی دعائے خلیل
زہے نصیب کہ تشریف لائے خیر انام

متاعِ لطف کی ارزانیاں ہوئیں کیا کیا
درِ جواد سے محروم کو ملا انعام

رہی نہ اہلِ قبائل میں کشمکش باقی
بنے وہ ایک ہی آقائے نامور کے غلام

ہوئی رسول کو حاصل حکومتِ دارین
بنا حضور کا دربار عدل گاہِ انام

صلاح کار ہیں بیشک زمین کے وارث
بنا تھا نغمۂ جاوید یہ خدا کا پیام

حریف جوشِ عداوت تھی قوتِ اخلاق
کیا جو آپ نے وہ کر سکے نہ رستم و سام

دکھا سکے نہ کماندار تیر اندازی
بہادروں کی ہوئی تیغ اندرونِ نیام

زبانِ پاک سے نکلی صدائے آزادی
رہا قفس نہ گرفتاریاں نہ حلقۂ دام

سیاسیات میں بے مثل آپ کی رائیں
معاملات میں بے لوث آپ کے احکام

صفائے روح تھی وحدت پرستیِ ملت
بقائے امن تھا آئین و عدل کا انجام

رہے خزانۂ عالم کے مالک و قابض
بنے نہ طالبِ زر پھر بھی شاہِ ذوالاکرام

ہوئے نہ کام و دہن آشنائے لقمۂ تر
گیا نہ خلعتِ شاہانہ زینتِ اندام

نہ فرش ہائے مکلف نہ پردہ ہائے حریر
نہ گھر میں کوئی سجاوٹ نہ رونقِ در و بام

بنا دیا مئے عرفاں سے مست عالم کو
کبھی ہوئی نہ تمنائے ساغرِ گل فام

نہ تاج و تخت کی پروا نہ خواہشِ درباں
مگر تھے زیرِ نگیں قوم کے صغار و عظام

ہوئے وہ شیر و شکر مل کے تھے جو نیک سرشت
الگ الگ رہے محبوبِ حق سے نافرجام

دکھائی شان حکومت گلیم پوشی میں
نہ تھی نمائشِ کسریٰ نہ شوکتِ بہرام

غرض حکومتِ نبیؐ کی یہ نہ تھی ہرگز
خدا کے ملک میں قایم ہو خود سرا نظام

یہ تھا حضور کی آمد کا مقصدِ اعظم
کہ دیں تمام خدائی کو دعوتِ اسلام

بڑھائے تزکیۂ نفس ذوقِ روحانی
ادب سے کوچۂ اخلاق میں ہوں گرم خرام

دریغ! ہم نے بھلائے اصولِ پیغمبر
فغاں کہ ہو گئے دنیا جہان میں بدنام

جو راہِ صدق میں ملت ہو حوصلہ فرسا
شریعتِ نبوی پھر بنے سبیلِ دوام

یہی ہے نذرِ لطاہیؔ یہی ہے ہدیۂ شوق
ہزار بار نبیؐ پر درود اور سلام

(۲۲۱) جامعہ عثمانیہ

(انتخاب از قصیدہ سال گرہ ہمایوں)

بتا رہا ہے تغیر نظامِ عالم کا
کہ علم سے نئے قالب میں ڈھل رہا ہے بشر

یہ علم وہ ہے جو سو زینتوں کی اک زینت
یہ علم وہ ہے جو سو زیوروں کا اک زیور

بڑھی ہے علم سے قوموں کی عقل و استعداد
ہوئی ہے غور سے اور فکر سے وسیع نظر

غرض ہے یہ شہِ آصف کی علم کا ہو ینبوع
بنائے قوتِ ذہنی کو ہر طرح بہتر

شکستِ رنگِ جہالت سے تیرگی مٹ جائے
اِدھر اُدھر ہوں فروزاں چراغِ علم و ہنر

ریاضیات کے پرتو سے ذہن ہو روشن
الٰہیات کے جلوے سے قلب ہو انوار

دکن میں جامعِ عثمانیہ وہ قایم ہو
دکن ہو مصر تو جامع ہو جامع ازہر

زبانِ ملک کو ہوں وہ ترقیاں حاصل
رہیں خزینۂ اُردو میں خوشنما گوہر

دماغِ قوم ہو روشن شعاعِ علمی سے
بنیں مفید کتابیں غذائے روح بشر

وہی علوم دکن میں ہوں جاری و ساری
کِسی زمانے میں یونان جن کا تھا مظہر

یہ مُدعا ہے وہی مُدعا جو ہے خوش کن
یہ آرزو ہے وہی آرزو جو ہے خوشتر

(۲۴۷) مناظرِ دولت آباد

ہے صبا سرگرم شوخی مستِ موجِ آبشار
لڑکھڑائے جس طرح نشہ میں کوئی نازنیں

مظہرِ فطرت فلک منزل پہاڑوں کی غذا
سنگ ریزے گھاٹیوں کے ہیں کہ ہیں درِ ثمیں

دفترِ قدرت کا مجموعہ ہیں پھولوں کے ورق
اور کوسوں تک پہاڑ ڈھانکی ہے سبزے نے زمیں

برف بھی اُس کی سپیدی سے ہوئی ہے آب آب
گھاٹ کی دیوار مضبوطی میں ہے کوہِ آہنیں

کوکتے ہیں ہر طرف صحرا میں طاؤسانِ مست
رہ نوردوں کو لبھاتی ہے نوائے دلنشیں

پر فشانی سے عیاں ہے جادۂ بالِ پری
ہر طرف پرواز میں مصروف مرغِ دانہ چیں

کیجیے آزاد ہو کر اک نئی بستی کی سیر
دل یہ کہتا ہے یہیں ہو جایئے خلوت گزیں

دو ہاتھوں کی ہم آغوشی ہے کتنی دلربا	ہو صف تسلیم بھی یہیں ہے اور درہ بھی یہیں

(۲۲۳) خلد آباد میں غار ایلورہ

غار ایلورہ عجب شے ہے دکن کے ملک میں	جسکی صنعت تصدق ہے نگارستانِ چین
عہدِ گوتم کے صنم خانے بنے ہیں زیر کوہ	دستکاری دیکھکر حیران ہیں نظارہ بیں
ایک جانب موجزن ہے آبشارِ خوشنما	ہے وہ تسو گز کی بلندی سے رواں سوئے زمیں
دیکھنے والی نظر کو ہو رہا ہے یہ گماں	سطحِ ارضی پر ہے بہتا چشمۂ خلد بریں
بُت تراشی کے نمونے گھاٹیوں کی تہہ میں ہیں	صنعتِ مغرب بھی ہے انکے مقابل شرمگیں
کہہ رہی ہیں غار کی سنگیں عمارات عجیب	کیا ہوئی وہ شان و شوکت کیا ہوئے اپنے مکیں

(۹۲) احسن سنہ ۱۸۷۵ء

احسن سید حافظ علی احسن خلف حاجی سید مجتبےٰ احسن مرحوم قصبۂ مارہرہ ضلع ایٹہ کے پیرزادوں میں ہیں شوال سنہ ۱۲۹۳ھ ۱۸۷۵ء میں پیدا ہوئے۔ کم سنی سے شاعری کا شوق ہے۔ حضرت داغ کے مشہور تلامذہ میں ہیں۔ فارسی میں خاصی مہارت ہے۔ عربی میں بھی دخل ہے۔ رسالہ فصیح الملک آپ کی ادارت میں جاری تھا۔ آجکل مسلم یونیورسٹی علی گڈھ میں لکچرار ہیں (۳۰ اگست سنہ ۱۹۴۰ء کو انتقال ہوگیا) نمونہ کلام حسب ذیل ہے:۔

(۲۴۳) غزل

دُنیا کا بھروسہ نہ سہارا مجھے دیں کا
اس عشقِ بد انجام نے رکھا نہ کہیں کا

قسمت میں جو ہونا ہے وہ ہو کر ہی رہے گا
لکھا ہوا مٹتا ہے کہیں لوحِ جبیں کا

تم نالۂ مظلوم کو بیکار نہ سمجھو
پایا نہ ہلادے وہ کہیں عرش بریں کا

ایسوں کو ستانا نہیں اچھا نہیں اچھا
لے صبر نہ اے چرخ کسی گوشہ نشیں کا

احسن کی تسلی تو ذرا کیجے آکر!
اب آ ہی گیا وقت دمِ بازپسیں کا

(۲۴۴)

بنی ہے دم پہ تو ایسا خیال ہوتا ہے
وگرنہ ترکِ تعلق محال ہوتا ہے

جما ہوا ہے تصور کچھ اس طرح دل میں
کہ خواب میں بھی اسی کا خیال ہوتا ہے

عتاب میں نہیں رہتی نقاب چہرے پر
عیاں جلال میں ان کا جمال ہوتا ہے

صفِ نیاز میں ہوتا ہے سر بلند وہی
تمھارے ہاتھ سے جو پائمال ہوتا ہے

ترے ستم پہ یہ ہوتا ہے دل کہ قطع کروں
مگر پھر اپنے کئے کا خیال ہوتا ہے

اُمیدِ صلح نہ رکھ بدمزاج سے احسن
کہ اس سے میل کے بدلے ملال ہوتا ہے

(۲۴۵)

سنگِ در بنکر بھی کیا حسرت مرے دل میں نہیں
تیرے قدموں میں ہوں لیکن تیری محفل میں نہیں

اُن کی بزمِ ناز کیا ہے عالمِ تصویر ہے
ہے یہ خاموشی کہ گویا کوئی محفل میں نہیں

راہِ الفت کا نشاں یہ ہے کہ ہے وہ بے نشاں
جادہ کیسا نقشِ پا تک کوئی منزل میں نہیں

بزم آرائی سے پہلے دیکھ او نادان دیکھ!
کون ہے محفل میں تیری کون محفل میں نہیں

رہ گئے زنداں میں کرینگے ہم کھلے بندوں فغاں
پاؤں ہے زنجیر میں لب تو سلاسل میں نہیں

ہو چکی مشقِ ستم بس او ستم ایجاد بس!
اب تڑپنے کی سکت بھی تیرے بسمل میں نہیں

پوچھتا ہے آرزو احسن تو کیا بار بار
تیرے ملنے کے سوا کوئی ہوس دل میں نہیں

(۹۳) حسرتؔ ۱۸۷۵ء

حسرتؔ۔ مولانا فضل الحسن۔ خلف سید اظہر حسن صاحب۔ موہان ضلع اناؤ کے باشندے ہیں۔ سالِ پیدائش تقریباً ۱۸۷۵ء مطابق ۱۲۹۲ھ ہے۔ ۱۹۰۳ء میں علی گڑھ کالج سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ زمانۂ طالب علمی سے سخن گوئی کا شوق ہے۔ تسلیم لکھنوی کے شاگرد ہیں۔ ان کا شمار پُرگو شعرا میں ہے۔ اردوئے معلیٰ نامی ماہوار رسالہ کے ذریعے عرصہ تک زبان اردو کی خدمت کی۔ چار دیوان شائع ہو چکے ہیں۔ دیوانِ غالب اردو کی شرح بھی لکھی ہے۔ ایک تذکرۃ الشعرا لکھنا شروع کیا تھا جس کے صرف چند حصے شائع ہو کر رہ گئے۔ عرصہ سے ان کے ادبی شوق پر سیاسی خیالات غالب ہیں۔ اس وقت تک ان کا دیوان دس حصوں میں

شایع ہوچکا ہی) نمونہ کلام یہ ہی: (افسوس ۱۳ر مئی ۱۹۵۱ء کو انتقال ہوگیا)

(۲۴۶) غزل ۵

ہر مشقِ سخن جاری جگر کی مشقت بھی
دل بس کہ ہی دیوانہ اُس حُسنِ گلابی کا
خود عشق کی بیتابی سب تجھ کو سکھا دے گی
دکھنے ہیں مرے دل پر کیوں تم سے بیتابی

اک طرفہ تماشہ ہی حسرت کی طبیعت بھی
رنگیں ہی سی رو سے تنا بد غم فرقت بھی
اُن کے حُسن حیا پرور ہی شوخی بھی شرارت بھی
ہاں ناز سے دردا کی جب مجھ میں ہو قوت بھی

ہیں شاد صفی شاعر یا شوق و فا حسرت
پھر ضامن و محشر ہیں اقبال بھی وحشت بھی

(۲۴۷)

ہوائے یار میں بھی رنگ و بوے یار پیدا ہو
یہ رنگیں ماجرائے عشق شیریں کار پیدا ہی
ترے روئے دل آرا کے تصور کا یہ عالم تھا
کہ چشم شوق میں اک حسن کا گلزار پیدا ہی
مرے اصرارِ مضطر میں نہاں تھی میری مایوسی
ترے اقرار آساں سے ترا انکار پیدا ہی

۵) یہ غزل بہ عالمت قید ۱۹۰۸ء میں لکھی گئی تھی ۱۲

طریقِ عشقِ جاناں ہے جُدا گبر و مسلماں کا
یہیں سے اختلافِ سبحہ و زنار پیدا ہی
نگاہِ آرزو گلچیں باغِ کامرانی ہے
بسانِ خواب شکلِ طالعِ بیدار پیدا ہی
وفا میری بہ شکلِ بے زبانی آشکارا تھی
ستم تیرا بہ رنگِ پرسشِ اغیار پیدا ہی
نسیمِ دہلوی کی پیروی آساں نہیں حسرت
تجھی سے ہو کہ یہ نیرنگیِ گفتار پیدا ہی

(۹۴) فانی ۱۸۷۹ء

مولوی شوکت علی خاں بی۔ اے۔ ال ال۔ بی بدایونی۔ پیدائش ۱۲۹۶ھ مطابق ۱۸۷۹ء بریلی کالج سے گریجویٹ ہیں ۱۹۰۱ء میں علی گڑھ کالج سے ایل۔ ایل بی ہوئے کئی سال تک لکھنؤ میں وکالت کرتے رہے آجکل بریلی میں قیام ہے۔ آپ کا کلام علیگڈھ کالج میگزین اور دیگر ماہوار رسالوں میں اکثر چھپتا رہتا ہی۔ ایک مختصر دیوان شائع ہو چکا ہی۔ اب حیدرآباد دکن میں انگریزی اسکول کے ہیڈ ماسٹر ہیں ان کا دیوان کچھ غزلوں کے اضافہ کے ساتھ دوبارہ بھی شائع ہو چکا ہی (۱۹۴۲ء میں انتقال ہو گیا) نمونہ کلام حسب ذیل ہی۔

(۲۴۹)

مری میت پہ اُنکا طرز ماتم کس بلا کا ہی
دل بے مدعا سے پوچھتے ہیں مدعا کیا ہی

مری آنکھوں میں آنسو تجھ سے ہمدم کیا کہوں کیا ہی
ٹھہر جائے تو انگارا ہی بہہ جائے تو دریا ہی

مری محرومیوں کا فیض جاری ہو رگ و پے میں
بدن میں جو لہو کی بوند ہی خونِ تمنا ہی

غبارِ اشک خارستانِ حسرت یاس کے منظر
ہمارے دل کی دنیا بھی کوئی دنیا میں دنیا ہی

نظر آتے ہیں دل میں آج پھر آثارِ بیتابی
ہم اے اُمید قسمت اس میں کچھ تیرا اشارا ہی

شبِ فرقت میں ہم ہر سانس میں یہ پوچھ لیتے ہیں
جگر تو خیریت سے ہی مزاج دل تو اچھا ہی

یہ کیا کہتے ہو فانی سے کہ تیری موت آئی ہی
تم اس ناکام کے دل سے تو پوچھو زندگی کیا ہی

(۹۵) چکبست ۱۸۸۲ء

چکبست[۱]. برج نرائن کشمیری پنڈت ہیں۔ ۱۸۸۲ء مطابق ۱۳۰۰ھ میں بمقام فیض آباد پیدا ہوئے۔ وطن لکھنؤ ہی کیننگ کالج لکھنؤ میں بی۔اے پاس کرکے ال۔ال۔بی کی ڈگری حاصل کی لکھنؤ میں وکالت کرتے ہیں۔ شاعری میں حضرت افضل کے تلمیذ ہیں رنگ قدیم وجدید دونوں میں طبع آزمائی کرتے ہیں ناظم و ناثر ہیں۔ ان کی نظموں کا مجموعہ صبح وطن کے نام سے ۱۹۱۶ء میں شائع ہوا ہی۔ آجکل ایک اردو رسالہ "صبح امید"

[۱] افسوس کہ قبل طبع ثانی تذکرۂ ہذا چکبست صاحب کا بتاریخ ۱۲ فروری ۱۹۲۶ء انتقال ہوگیا

لکھنؤ سے نکالتے ہیں۔ نمونہ کلام حسب ذیل ہے:۔

(۲۴۹) غزل

عزیزانِ وطن کو غنچہ و برگ و ثمر جانا
خدا کو باغباں اور قوم کو ہم نے شجر جانا

اجل کی نیند میں بھی خواب ہستی گر نظر آیا
تو پھر بیکار ہی ننگ آ کے اس دنیا سے مر جانا

چمن زارِ محبت میں اُسی نے باغبانی کی
کہ جس نے اپنی محنت ہی کو محنت کا ثمر جانا

وہ سودا زندگی کا ہے کہ غم انسان سہتا ہے
نہیں تو ہے بہت آسان اس جینے سے مر جانا

وہ طبع پاس پرور نے جسے چشم حقیقت دی
کہ شام غم کی تاریکی کو بھی نور سحر جانا

(۲۵۰) راماین کا ایک سین

رخصت ہوا وہ[ملہ] باپ سے لیکر خدا کا نام
راہِ وفا کی منزل اول ہوئی تمام

منظور تھا جو ماں کی زیارت کا انتظام
دامن سے اشک پونچھ کے دل سے کیا کلام

آخر ہے کچھ حدِ ستم و ظلم و جور بھی
ہم کو اداس دیکھ کے غم ہوگا اور بھی

دل کو سنبھالتا ہوا آخر وہ خوش خصال
خاموش ماں کے پاس گیا صورت خیال

دیکھا تو ایک در میں وہ بیٹھی ہے خستہ حال
سکتہ سا ہو گیا ہے یہ ہے شدتِ ملال

تن میں لہو کا نام نہیں زرد رنگ ہے
گویا بشر نہیں کوئی تصویرِ سنگ ہے

ملہ وہ کا اشارہ رامچندر جی کی طرف ہے۔

کیا جانے کس خیال میں گم تھی وہ بے گناہ
جنبش ہوئی لبوں کو بھری ایک سرد آہ

نورِ نظر پہ دیدۂ حسرت سے کی نگاہ
لی گوشہ ہائے چشم سے اشکوں نے رخ کی راہ

چہرے کا رنگ حالتِ دل کھولنے لگا
ہر موئے تن زباں کی طرح بولنے لگا

آخر اسیرِ یاس کا قفلِ دہن کھلا
اک دفترِ مظالمِ چرخِ کہن کھلا

افسانۂ شدائد رنج و محن کھلا
وا تھا دہانِ زخم کہ بابِ سخن کھلا

دردِ دلِ غریب جو صرفِ بیاں ہوا
خونِ جگر کا رنگ سخن سے عیاں ہوا

رو کر کہا خموش کھڑے کیوں ہو میری جاں
سب کی خوشی یہی ہے تو صحرا کو ہو رواں

میں جانتی ہوں جس لئے آئے ہو تم یہاں
لیکن میں اپنے منہ سے نہ ہرگز کہونگی ہاں

کس طرح بن میں آنکھوں کے تارے کو بھیجدوں
جوگی بنا کے راج دُلارے کو بھیجدوں

دنیا کا ہو گیا ہے یہ کیسا لہو سپید
انجام کیا ہو کوئی نہیں جانتا یہ بھید

اندھا کئے ہوئے ہے زر و مال کی اُمید
سوچے بشر تو جسم ہو لرزاں مثال بید

لکھی ہے کیا حیاتِ ابد ان کے واسطے
پھیلا رہے ہیں جال یہ کس دن کے واسطے

لیتی کسی فقیر کے گھر میں اگر جنم
ہوتے نہ میری جان کو سامان یہ بہم

ڈستا نہ سانپ بن کے مجھے شوکت و حشم
تم میرے لال تھے مجھے کس سلطنت سے کم
میں خوش ہوں پھونک دے کوئی اس تخت و تاج کو
تم ہی نہیں تو آگ لگاؤں گی راج کو

کن کن ریاضتوں سے گزارے ہیں ماہ و سال
لائے دلہن جو بیاہ کے شادی ہوئی کمال
دیکھی تمہاری شکل جب اس میرے نونہال
آفت یہ آئی مجھ پہ ہوئے جب سفید بال
چھٹتی ہوں اُن سے جوگ لیا جن کے واسطے
کیا سب کیا تھا میں نے اسی دن کے واسطے

ایسے بھی نامراد بہت آئیں گے نظر
گھر جن کے بے چراغ رہے آہ عمر بھر
رہتا مرا بھی نخلِ تمنا جو بے ثمر
یہ جائے صبر تھی کہ دعا میں نہیں اثر
لیکن یہاں تو بن کے مقدر بگڑ گیا
پھل پھول لا کے باغِ تمنا اُجڑ گیا

سرزد ہوئے تھے مجھ سے خدا جانے کیا گناہ
آتی نظر نہیں کوئی امن و اماں کی راہ
منجدھار میں جو یوں مری کشتی ہوئی تباہ
اب یاں سے کوچ ہو تو عدم میں ملے پناہ
تقصیر میری خالقِ عالم بحل کرے
آسان مجھ غریب کی مشکل اجل کرے

سُن کر زباں سے ماں کی یہ فریاد درد خیز
عالم یہ تھا قریب کہ آنکھیں ہوں اشک ریز
اُس خستہ جاں کے دل پہ چلی غم کی تیغ تیز
لیکن ہزار ضبط سے رونے سے کی گریز

سوچا یہی کہ جاں سے میکیں گزر نہ جائے
ناشاد ہم کو دیکھ کے ماں اور مر نہ جائے

پھر عرض کی یہ مادرِ ناشاد کے حضور
صدمہ یہ شاق عالم پیری میں ہے ضرور
مایوس کیوں ہیں آپ الم کا ہے کیوں وفور
لیکن نہ دل سے کیجئے صبر و قرار دور
شاید خزاں سے شکل عیاں ہو بہار کی
کچھ مصلحت اسی میں ہو پروردگار کی

یہ جہل یہ فریب یہ سازش یہ شور و شر
اسباب ظاہری ہیں نہ ان پر کرو نظر
ہونا ہے جو سب اسکے بہانے ہیں سربسر
کیا جانے کیا ہے پردۂ قدرت میں جلوہ گر
خاص اس کی مصلحت کوئی پہچانتا نہیں
منظور کیا اسے ہے کوئی جانتا نہیں

راحت ہو یا کہ رنج، خوشی ہو کہ انتشار
تم ہی نہیں ہو کشتۂ نیرنگ روزگار
واجب ہر ایک رنگ میں ہے شکر کردگار
ماتم کدہ میں دہر کے لاکھوں ہیں سوگوار
سختی سہی نہیں کہ اٹھائی کڑی نہیں
دنیا میں کیا کسی پہ مصیبت پڑی نہیں

دیکھے ہیں اس سے بڑھ کے زمانے نے انقلاب
سوزِ دروں سے قلب و جگر ہو گئے خراب
جن سے کہ بے گناہوں کی عمریں ہوئیں خراب
پیری مٹی کسی کی کسی کا مٹا شباب
کچھ بن نہیں پڑا جو نصیبے بگڑ گئے

وہ بجلیاں گریں کہ بھرے گھر اجڑ گئے

ماں باپ منہ ہی دیکھتے تھے جن کا ہر گھڑی
دامن پہ جن کے گرد بھی اُڑ کر نہیں پڑی
قائم تھیں جن کے دم سے امیدیں بڑی بڑی
ماری نہ جن کو خواب میں بھی پھول کی چھڑی
محروم جب وہ گل ہوئے رنگ حیات سے
اُن کو جلا کے خاک کیا اپنے ہات سے

کہتے تھے لوگ دیکھ کے ماں باپ کا ملال
ان بیکسوں کی جان کا بچنا ہے اب محال
ہے کبریا کی شان گزرتے ہی ماہ و سال
خود دل سے درد ہجر کا مٹتا گیا خیال
ہاں کچھ دنوں تو نوحہ و ماتم ہوا کیا
آخر کو رو کے بیٹھ رہے اور کیا کیا

پڑتا ہے جس غریب پہ رنج و محن کا بار
کرتا ہے اس کو صبر عطا آپ کردگار
مایوس ہو کے ہوتے ہیں انساں گناہ گار
یہ جانتے نہیں کہ وہ ہے دانائے روزگار
انساں اسی کی راہ میں ثابت قدم رہے
گردن وہی ہے امر رضا میں جو خم رہے

اور آپ کو تو کچھ بھی نہیں رنج کا مقام
ہوتے ہیں بات کرنے میں چودہ برس تمام
بعد سفر وطن میں ہم آئیں گے شاد کام
قائم امید ہی سے ہے دنیا ہے جس کا نام
اور یوں کہیں بھی رنج و بلا سے مفر نہیں
کیا ہوگا دو گھڑی میں کسی کو خبر نہیں

اکثر ریاض کرتے ہیں پھولوں پہ باغباں
ہے دن کی دھوپ رات کی شبنم انھیں گراں
لیکن جو رنگِ باغ بدلتا ہے ناگہاں
وہ گل ہزاروں پردوں میں جاتے ہیں رائیگاں
رکھتے ہیں جو عزیز انھیں اپنی جاں کی طرح
ملتے ہیں دستِ یاس وہ برگِ خزاں کی طرح

لیکن جو پھول کھلتے ہیں صحرا میں بے شمار
موقوف کچھ ریاض پہ ان کی نہیں بہار
دیکھو یہ قدرتِ چمن آرائے روزگار
وہ ابر و برق و باد میں رہتے ہیں برقرار
ہوتا ہے اُن پہ فضل جو ربِّ کریم کا
موجِ سموم بنتی ہے جھونکا نسیم کا

اپنی نگاہ ہے کرمِ کارساز پر
صحرا چمن بنے گا وہ ہے مہرباں اگر
جنگل ہو یا پہاڑ سفر ہو کہ ہو حضر
رہتا نہیں وہ حال سے بندے کے بے خبر
اس کا کرم شریک اگر ہے تو غم نہیں
دامانِ دشت دامنِ مادر سے کم نہیں

(۹۶) عزیزؔ ۱۸۸۲ء

عزیز۔ مرزا محمد ہادی۔ ابن مرزا محمد علی صاحب شرفائے لکھنؤ سے ہیں ۲۵ ربیع الثانی ۱۲۹۹ھ مطابق ۱۸۸۲ء کو بمقام لکھنؤ پیدا ہوئے۔ فارسی و عربی میں ذی استعداد ہیں

امین آباد ہائی اسکول میں مدرس ہیں۔ اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں آپ کا کلام حقیقی جذبات کا معیار ہے۔ علاوہ اور تصانیف کے دیوان اُردو "گلکدہ" کے نام سے شائع ہوچکا ہے۔ افسوس کہ ۱۳۵۴ھ میں انتقال ہوگیا۔ نمونۂ کلام پیش کیا جاتا ہے۔

(۲۵۱) غزل

طبقۂ خاک میں اک عالمِ پنہاں نکلا / دل بھر آیا جو سوئے گورِ غریباں نکلا

قبر تک لاش گئی۔ ساتھ ہوا اک عالم / یوں رہا ہو کے ترا قیدیِ زنداں نکلا

ہاتھ بڑھتا تھا کہ رگ رگ میں لہو دوڑ گیا / پھر وہی رحلۂ چاکِ گریباں نکلا

روح اس پیکرِ تعمیر کی تھی ویرانی / ذرّے ذرّے میں مرے گھر کے بیاباں نکلا

پردۂ گل سے ہوا فاش جنوں کا پردہ / کون محفل سے تری چاکِ گریباں نکلا

آہ! وہ دل کہ جو تھا معتکفِ استغنا / کوچۂ یار میں منّت کشِ درباں نکلا

خودکشی سے بھی ہوئی کار برآری نہ عزیزؔ / سہل جو کام تھا وہ بھی تو نہ آساں نکلا

(۲۵۲)

حقیقت میں جو سیرِ عالمِ ایجاد کرتے ہیں / وہ ہر ذرّے میں اک دنیا نئی آباد کرتے ہیں

ہمارے ضبط میں پنہاں ہے نظمِ عالمِ ہستی
نہ ہو تم کو یقیں اس کا تو ہم فریاد کرتے ہیں

کوئی دنیا کی قوت اب مٹا سکتی نہیں تجھ کو
زمینِ دل تجھے جب ہم اس طرح آباد کرتے ہیں

نہ پوچھ اے عشقِ پُرمایہ حقیقت اُن کی ہستی کی
جو اپنے ساتھ اس دنیا کو بھی آزاد کرتے ہیں

نکالی جا رہی ہیں ہڈیاں کچھ قید خانے سے
اسیرانِ محبت کو وہ آج آزاد کرتے ہیں

بس اب اے روح جلدی اپنے مرکز کی طرف پھر جا
فقط تھا انتظار اس کا وہ کیا ارشاد کرتے ہیں

عدم کے قافلے ہم کو خبر دیتے ہیں آ آ کے
عزیزانِ وطن تم کو عزیز اب یاد کرتے ہیں

(۹۷) مزاج ۱۸۸۲ء

سید نثار احمد والد کا نام سید قاسم علی پیدائش دوم ماہ ذی الحجہ ۱۳۰۰ھ مطابق ۱۸۸۲ء سیدنا امام جعفر صادق علیہ السلام کی اولاد سے ہیں سبزواری سے

ہندوستان آئے۔ اس لئے جعفری سبزواری کہلاتے ہیں شاہجہاں بادشاہ دہلی کو انکے مورث سے بادشاہ انتساب سے نہایت عقیدت تھی، ۱۷ مواضع بطور جاگیر معافی عطا ہوئے اس میں ایک موضع ٹھٹولی تحصیل کاسگنج میں اب تک ان کے خاندان میں باقی ہے۔ اردو میں مزاج فارسی میں احمدی تخلص کرتے ہیں دس سال کی عمر سے شعر کہتے ہیں حضرت داغ دہلوی سے تلمذ ہے۔ عاشقانہ رنگ کے علاوہ قومی نظمیں بھی لکھتے ہیں وطن علیگڈھ ہے اس وقت سرکار آصفیہ میں بہادر کے تعلقدار اول ہیں۔

(۲۵۳)

خدا کی خدائی میں کیا کیا نہیں ہے — ہمیں کو مگر چشم بینا نہیں ہے

مجھے قبر میں کوئی کھٹکا نہیں ہے — کہ یاں جینے مرنے کا جھگڑا نہیں ہے

یہاں عرضِ مطلب کا یارا نہیں ہے — انہیں بات سننی گوارا نہیں ہے

کبھی جو نہ نکلے وہ حسرت ہے میری — جو بر آئے میری تمنا نہیں ہے

تجھے لیکے ہم کیا کریں بادشاہی — ہمیں کو جو دنیا میں رہنا نہیں ہے

کہاں حسنِ صورت کہاں حسنِ معنی — مصور پہ نقشہ وہ نقشا نہیں ہے

مرا درد میری دوا بن چکا ہے — مجھے احتیاجِ مسیحا نہیں ہے

پڑی مے کدے پر یہ کیا اوس ساقی — کہ بیہوش ہوئے دورِ صہبا نہیں ہے

یہ بے تابیاں رنگ لاکر رہیں گی — مزاج اس کا انجام اچھا نہیں ہے

(۲۵۴)

ایماں نواز گردشِ پیمانہ ہو گئی
پھر چھیڑ کیا یہ اک دلِ دیوانہ ہو گئی

پھر باعثِ ظہور ہوا حسنِ خود پسند
اب راہِ مغفرت رہِ میخانہ ہو گئی

غرفے سے کس نے جھانک کے ہنگامہ کر دیا
وہ آشنا نگاہ بھی بیگانہ ہو گئی

ساقی کو دیکھتے ہی خمِ مے پہ گر پڑا
پھر رسم و راہِ آئنہ و شانہ ہو گئی

جو بات دل سے تا بہ لب آئی نہ تھی کبھی
کل کائنات بزمِ حریفانہ ہو گئی

اب دل کہاں کہاں خلشِ خارِ آرزو
زاہد سے بھی یہ حرکتِ رندانہ ہو گئی

ذرّے بھی خاک کے انھیں اب جانتے نہیں
مجبوریوں سے دل کی وہ افسانہ ہو گئی

جاں ہی فدائے جلوۂ جانانہ ہو گئی

کسریٰ کی کیا وہ شوکتِ شاہانہ ہو گئی

وحشت نے کھو دیا اثر ہائے ہو مزاج
آہِ رسا بھی نعرۂ مستانہ ہو گئی

(۲۵۵)

مری بندگی نے بتا دیا کہ یہ راز ہی ترے ناز ہیں
ترا ساز ہی مرے سوز ہیں مرا سوز ہی ترے ساز ہیں

نہ الجھ الجھ کے تو چل صبا کہیں کھل نہ جائے وہ بل صبا
کہ ہزاروں دل ہیں بندھے ہوئے خم و پیچ زلف دراز ہیں

کہیں طے ہوں زیست کے مرحلے مجھے مرکے آب بقا ملے
کہ غبار بن کے اڑا کرے مری خاک، راہ حجاز میں

وہی نار ہے وہی نور ہے۔ وہی جلوہ گاہ ظہور ہے
وہی شعلۂ سرِ طور ہے جو نہاں ہے پردۂ راز میں

یہ جہاں ابلہ فریب ہے نہ فراز ہے نہ نشیب ہے
وہی بستیاں ہیں نشیب کی جو بلندیاں ہیں فراز میں

کبھی پردہ در ہوں جلال کا، کبھی پردہ دار جمال ہوں
ہیں نہاں ہزار حقیقتیں مرے ایک رنگِ مجاز میں

(۹۸) لطف ۱۸۸۲ء

نواب لطف الدولہ بہادر نبیرہ نواب خورشید جاہ بہادر پیدائش ۱۳۰۰ھ مطابق ۱۸۸۲ء اس وقت سرکار آصفیہ (حیدرآباد دکن) میں صیغہ تعمیرات کے وزیر ہیں۔ نعت اور حمد میں طبع آزمائی فرماتے ہیں نہایت صاف اور ستھرا اور نکھرا ہوا کلام ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

(۲۵۶)

ہے نور الٰہی کی جلوہ فگنی تم سے
کونین منور ہے او مدنی تم سے

ہے باغِ دو عالم کی تم سے چمن آرائی
پہونچی ہے گلوں کو بھی گل پیرہنی تم سے

ہر شے سے ہویدا ہے ہو وجہِ وجودِ کل
یہ گلشنِ عالم ہے سرسبز چمنی تم سے

لولاک لما والے جو کچھ ہو تمھیں تم ہو
اعیان ہوئے ثابت سب خلق بنی تم سے

مقبول کلام ایسا ہو طائرِ سدرہ کا
سیکھی ہے اگر اس نے شیریں سخنی تم سے

کہتا ہوں غنی کر دو دیدار کی دولت سے
کس چیز کا طالب ہو اللہ غنی تم سے

جو سینہ بنا رہ صافی شیخ قرنی کو تھی
طالب ہو اسی کا یہ لطفِ اوینی تم سے

(۲۵۷)

اذیتیں دل کو سب پہونچیں بتوں سے کیا ایک جہاں سے ہم کو
شکایت اپنے نصیب کی ہے گلہ نہیں آسماں سے ہم کو

نہ قول و عہد و قسم سے مطلب غرض نہیں ہے زباں سے ہم کو
کلام سننا ہے آج کوئی زبانِ معجز بیاں سے ہم کو

سنائیں کیا حالِ دل انھیں ہم چھپائیں کیا حال دلکو انسے
سکوت سے فائدہ نہ کوئی نہ کچھ ہو حاصل بیاں سے ہم کو

یہ صاف معلوم ہو رہا ہے عدو سے ملنا غلط نہیں ہے
تمہارے انداز گفتگو سے تمہارے طرز بیاں سے ہم کو

بھلے سہی غیر ہم نے مانا بھلا کہو تم بلا سے اُن کو
بُرے سہی ہم مگر نہ بولو بُرا تم اپنی زباں سے ہم کو
ٹھنی ہے دل میں کریں گے سودا کسی کی زلفوں سے دل کو دیکر
نہ فائدے سے کوئی خوشی ہے نہ رنج ہے کچھ زیاں سے ہم کو
وہ جانے والے ہیں غیر کے گھر مدد کر اے شور نالۂ دل
جگاتا ہے فتنۂ قیامت کو آج خوابِ گراں سے ہم کو
وفا شعاری و جاں نثاری یہی ہے طرزِ روش ہماری
تمھاری چالیں عدو کی گھاتیں بھلا یہ آئیں کہاں سے ہم کو
کبھی ہے کل کو اور کبھی ہے پرسوں کرو گے حیلے بہانے کب تک
تمہارے دل میں نہیں جو آنا تو صاف کہہ دو زباں سے ہم کو
ازل سے ہے سجدہ گہ ہماری یہیں گذاریں گے عمر ساری
مٹا وہ خطِ جبیں کو پہلے اُٹھاؤ پھر آستاں سے ہم کو
انھیں کا ہے نام حضرت لطف یہی تو مشہور پارسا ہیں
دکھائی دیتے ہیں مے کدہ میں خموں کے جو درمیاں سے ہم کو

(۹۹) اثر ۱۸۸۵ء

اثر۔ مرزا جعفر علی خاں ۱۲ جولائی ۱۸۸۵ء مطابق ۱۳۰۳ھ تاریخ ولادت لکھنؤ مولد اور وطن ہے۔ کیننگ کالج لکھنؤ سے ۱۹۰۶ء میں بی۔ اے پاس کیا۔ ۱۹۰۹ء میں صوبہ متحدہ میں ڈپٹی کلکٹری کے عہدہ پر مامور ہوئے۔ آج کل اناؤ میں ڈپٹی کلکٹر ہیں اساتذۂ اردو کے کلام کا گہرا مطالعہ کیا ہے جس کی جھلک ان کی غزلوں میں پائی جاتی ہے بعض انگریزی نظموں کے ترجمے نظم میں لکھے ہیں۔ ان کے کلام کا مجموعہ "اثرستان" کے نام سے حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ عزیز لکھنوی سے تلمذ ہے۔ نمونۂ کلام یہ ہے:۔

(۲۵۹) غزل

یاد ایام کہ جب غم سے سروکار نہ تھا
پھول ہی پھول تھے دامن میں کوئی خار نہ تھا

عالم حسن کے جلوے تھے مری نظروں میں
جنس الفت کا سوا میرے خریدار نہ تھا

کیسی راحت میں شب و روز بسر ہوتے تھے
شعلۂ آہ نہ تھا دیدۂ خونبار نہ تھا

محو نظارہ تھا عشرت کدۂ ناز میں دل
واقف درد نہ تھا خوگر آزار نہ تھا

شوق آغوش تمنا میں بھٹکتا تھا اثر
نفس سرد نہ تھا اشک شرر بار نہ تھا

آئنہ خانۂ دل میں تھا نہ ہی جلوۂ فردوس
عشق خودکام کو اندیشۂ اغیار نہ تھا

پردہ ور ہوش نہ تھی عقل خبردار نہ تھی
لاکھ اسرار تھے دل محرمِ اسرار نہ تھا
عشق اک راز تھا گنجینۂ دل میں پنہاں
غمِ ہستی سے مجھے کوئی سروکار نہ تھا
نغمۂ شوق سے لبریز تھا ہر تارِ نفس
کون سا لطف تھا دل جس کا سزاوار نہ تھا
بڑھتے بڑھتے جو ہوا جذبۂ الفت کامل
دستِ وحشت سے گریباں میں کوئی تار نہ تھا
ٹھوکریں کھائیں زمانے کی مصیبت جھیلی
کون آزار تھا میں جس میں گرفتار نہ تھا
دفعتہً دیدۂ دل وا ہوئے چمکا اک نور
وہ سماں دیکھا کہ جس کے لئے تیار نہ تھا
بجلیاں ٹوٹ پڑیں عشق پہ مجھے غش آیا
آنکھ کھلتے ہی دو عالم سے سروکار نہ تھا
آخرکار ہوا رہبر ذوقِ فنا
بند آنکھیں تھیں مگر خواب گرانبار نہ تھا

روح پرور یہ صدا کانوں میں آتی تھی اثر
ڈھونڈنے والے کو ملنا مرا دشوار نہ تھا!

(۲۵۹)

عقل ہے دنگ اے کریم تیرا اشعار دیکھ کر
بخش دیے مرے گنہ ان کا شمار دیکھ کر
ساقی و بزمِ مے نہیں مطرب و چنگ و نے نہیں
روؤں نہ زار زار کیوں ابرِ بہار دیکھ کر

مرنے کے بعد بھی ذرا چین نہ قبر میں ملا
اُس نے مجھے جگا دیا سوئے مزار دیکھ کر

چاک ہو قبائے گل بادِ سحر کی چھیڑ سے
مست ہر ایک نخل ہے جوشِ بہار دیکھ کر

بیم نہیں رجا نہیں، رشک نہیں فغاں نہیں
پھر گیا دل بہشت سے کوچۂ یار دیکھ کر

شورشِ دل نے ای اثر کیا کہوں کیا مزا دیا
اس نے نمک چھڑک دیا سینہ فگار دیکھ کر

(تمام شد)